تاریخ خیرپور

نسیم امروہوی

ورثہ

بالاشتراک نسیم امروہوی میموریل سوسائٹی، ٹورنٹو، کینیڈا

©جملہ حقوق محفوظ ہیں

اس کتاب کے متن اور تصاویر کے جملہ حقوق محفوظ ہیں۔

مترجم/ناشر کی تحریری اجازت اور حوالے کے بغیر اس کتاب کا کوئی بھی حصہ طباعتی/برقی ذرائع ابلاغ پر استعمال کرنے پر پابندی ہے۔ اگر اس کے برعکس کوئی صورت حال ظہور پذیر ہوتی ہے تو قانونی کارروائی کا حق محفوظ ہے۔

قانونی مشیر: قادر خان لاء ایسوسی ایٹس، کراچی۔

سرورق محمد مختار علی

اہتمام اشاعت: عقیل عباس جعفری

کمپوزنگ / لے آوٹ ڈیزائننگ: برکت علی

اشاعت ثانی: 2021ء

قیمت: =/800روپے

ناشر: ورثہ پبلی کیشنز،

1/94، 26ویں اسٹریٹ فیز 6، ڈی ایچ اے، کراچی

بالاشتراک نسیم امروہوی میموریل سوسائٹی، ٹورنٹو، کینیڈا

فون 0300-9242098

ای میل aqeelabbasjafri@gmail.com

تقسیم کار: فضلی بک سپر مارکیٹ۔

507/3، ٹیمپل روڈ، اردو بازار، کراچی۔

مجھے اس کتاب کی تصنیف کا پورا واقعہ سنایا اور کہا کہ:

''مولانا نے تقسیم ہند سے پہلے 1939ء میں تین سو بند (900 اشعار) کا ایک سیاسی اور انقلابی مسدس ''برق و باراں'' کے نام سے تصنیف کیا تھا جو لاہور شائع ہوا تھا۔ اس مسدس میں آپ نے مسلمانوں کو حق خود اختیاری حاصل کرنے کی ترغیب دی ہے اور کانگریس نیز ہندوؤں کے خلاف مشتعل کیا ہے۔ وجود پاکستان کے بعد 1950ء میں یہ مسدس کس طرح حکومت ہند کے ہاتھ لگ گیا اور مولانا کے خلاف بغاوت کے الزام میں مقدمہ قائم کیے جانے کی خبر مشہور ہوگئی۔ چنانچہ آپ اس خبر کو سنتے ہی اپنا سب کچھ وہیں چھوڑ کر یک ہندوستان سے چل کھڑے ہوئے اور 16 مئی 1950ء کو لاہور میں مع اہل وعیال کے تشریف لے آئے اور میرے مہمان ہوئے۔ حکومت ہند کے معاندانہ رویہ اور قدم قدم پر گرفتاری کے اندیشوں نے مولانا کو ناگہانی طور پر نقل وطن کے لیے مجبور کیا تھا۔ اس لیے آپ بالکل بے بسر و سامانی کے عالم میں بھارت سے چل کھڑے ہوئے تھے اور ضرورت تھی کہ یہاں پہنچتے ہی فوری طور پر کچھ کام کریں۔ چنانچہ میری تحریک سے آپ نے نفسیات کے موضوع پر قلم برداشتہ یہ کتاب لکھنا شروع کردی جو سات یا آٹھ دن میں مکمل ہوگئی اور اس وقت تک دس ہزار کے قریب شائع ہو چکی ہے''۔

میں نے گھر آکر بڑے اشتیاق سے اس کتاب کو پڑھا۔ واقعی بڑی اچھی چیز ہے۔ ڈیل کارنیگی کے رنگ میں لکھی گئی ہے۔ مگر واقعات اور مثالیں سب مشرقی مذاق کی ہیں۔ جنھوں نے اس کتاب کو ایک مستقل تصنیف کی حیثیت دے دی ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ کے بعد مجھے مولانا کی دیگر تصانیف کی جستجو ہوئی چنانچہ شیخ صاحب کے کتب خانے میں آپ کی حسب ذیل کتابیں اور دستیاب ہوئیں۔

نسیم اللغات	(بڑا سائز، اردو کے لغات ومحاورات کی تشریح)		1000 صفحات
آئین اردو	(اردو قواعد وانشا نویسی بی۔اے تک کے طلبا کیلیے)	6 حصہ	1500 صفحات
ادبی کہانیاں	(تلمیحات کی لغت)		300 صفحات
ملاپ	(ڈراما)		48 صفحات
گلزار نسیم	(بچوں کی نظمیں)	6 حصہ	400 صفحات
الصرف	(عربی قواعد)		100 صفحات
النحو	(عربی قواعد)		100 صفحات

ان علمی کتابوں کے علاوہ درسیات کے سلسلہ میں بھی آپ نے سولہ ریڈریں پاکستان آکر مرتب کی ہیں جو اس وقت پنجاب، کراچی اور بہاولپور کے مدارس میں پڑھائی جاتی ہیں اور تینوں مقامات کے

گو کہ اس عالم حیرت میں وہ تھے ہوش بھم　　تھا مگر دل میں تپاں ولولہ سیر ارم
در کے اندر ابھی رکھنے بھی نہ پایا تھا قدم　　ناگہاں آئی اک آواز، کہاں جاتا ہے تھم

کھینچ لائی ہے تصور کی جسارت تجھ کو
داخلہ کی نہیں جنت میں اجازت تجھ کو

رضوان کے اس طرح ٹوک دینے پر آپ بگڑ جاتے ہیں اور اس سے کہتے ہیں کہ میرے چہرے پر تقدس کا نور اور ماتھے پر سجدے کا نشان بھی کیا تجھے نہیں دکھائی دیتا؟ کیا یہ اہل جنت کی علامت نہیں ہیں؟ اس کے بعد فرماتے ہیں۔

میرے چہرے پہ نظر ڈال کے رضواں نے کہا　　بارک اللہ یہ پر مکر لباس تقویٰ
سجدۂ زہد ریائی کا جبیں پر دھبا　　ظاہری شکل و شباہت کی کشش کیا کہنا

روح بھی پاک ہے کیا جامہ تقویٰ کی طرح
دل بھی پر نور ہے ریش رخ زیبا کی طرح

اس پر رضوان سے پر لطف بحث چھڑ جاتی ہے۔ آپ اپنے قسم قسم کے اعمال شخصی واجتماعی کو سفارش میں پیش کرتے ہیں اور رضوان ان سب دلائل کو رد کر دیتا ہے۔ اس طرح ایک طویل مباحثے میں ہر شخص کے لیے اپنے اعمال کا جائزہ لینے کے موقع فراہم کرنے کے بعد عشق محمد کو معرض بیان میں لاکر وسیلہ قرار دیتے ہیں۔ جس پر رضوان محض نظارۂ جنت کی اجازت دے دیتا ہے۔ آپ بڑے اشتیاق سے جنت کے ساز وسامان کا دور سے معائنہ کرتے ہیں اور پھر کہتے ہیں۔

شوق نے مجھ کو بڑھایا جو بصد جوش وخروش　　بولا رضوان کہ اے شاعر ہنگامہ فروش!
بے خبر، خواب میں ہے تو یہ نہیں عالم ہوش　　حسرت جنت وکوثر ہے تو برخیز وبکوش

عالم خواب میں فردوس کی تصویر یہ ہے
کام لے دیدۂ بیدار سے تعبیر یہ ہے

یہ سخن سن کے جو ٹوٹا وہ طلسم غفلت!　　کیا بتاؤں جو ہوئی قلب حزیں کی حالت
آنکھیں مل کر جو نظر کی بہ نگاہ حسرت　　نہ وہ جنت تھی نہ رضوان نہ بحث و حجت

کشمکش تھی نہ کشاکش میں سینہ باقی
غیرت بے عملی کا تھا پسینہ باقی

غرض کہ مولانا نسیم نے اپنے مراثی میں جابجا اصلاح قوم کے نئے نئے گوشے پیدا کر کے اس

میں ضلع سکھر اور جودھ پور کے ریگستانوں اور جنوب مشرق میں ضلع تھر پارکر کے ریگستان سے ملا ہوا ہے۔ اس ریگستانی علاقہ کو ہمیشہ نا قابل زراعت سمجھ کر نظر انداز کیا جاتا رہا۔ مگر حال میں اس ریگستان کا گہری نگاہ سے جائزہ لینے پر معلوم ہوا کہ اس کے بیشتر حصے کو غیر آباد سے آباد اور بنجر سے قابل کاشت بنایا جاسکتا ہے۔ چنانچہ ریت کے اس سمندر کو سبزہ زار کی صورت میں تبدیل کرنے کی اسکیم مرتب ہو چکی ہے۔ اس اسکیم کے بعض اجزا کو عملی جامہ پہنایا جارہا ہے، اس علاقہ کے طویل و عرض میں اونٹوں اور بھیڑوں کے چارے کے درخت اور جھاڑ جھنکاڑ کے جنگل قدیم الایام سے پائے جاتے ہیں جنھیں اب زمین مزروعہ کی شکل دی جارہی ہے۔

ریاست میں ایک پہاڑی سلسلہ بھی ہے جو اٹھارہ میل تک روہڑی کی جانب چلا گیا ہے۔ اس کی بلندی سطح سمندر سے چار سوفٹ اور ملحقہ علاقوں سے تین سوفٹ زیادہ ہے۔ یہ تمام پہاڑیاں بے برگ و گیاہ اور سبزہ و درخت سے تقریباً برہنہ ہیں اور ان کی برہنگی اور ویرانی ریگستان کے مہیب اور اجاڑ مناظر سے قطعاً ہم آہنگ ہے۔ قدیم الایام میں بارش کے بعد ان سنگ دل پہاڑوں کے سینہ سے چند ندی نالے پھوٹ نکلتے تھے۔ جن سے وادیوں میں تھوڑی بہت زراعت ہو جاتی تھی۔ اس کے علاوہ کوئی ذریعۂ آب پاشی نہ تھا۔ مگر اب جگہ جگہ نہروں کا پانی پہنچایا گیا ہے۔ جس سے یہ حصہ ارض بھی کافی زرخیز ہو گیا ہے۔

ریاست کے شمال اور مغربی علاقے، آب وہوا، موسم اور زرعی حالت کے اعتبار سے سکھر اور حیدرآباد کے علاقوں سے مشابہ ہیں۔ باقی حصوں کی آب وہوا شمالی سندھ کے مماثل ہے۔ یعنی موسم سرما میں اکثر اتنی سردی پڑتی ہے کہ یخ جم جائے اور گرمی میں حرارت کی یہ شدت ہوتی ہے کہ درجہ حرارت ایک سو بیس ڈگری تک پہنچ جاتا ہے۔ سردی کا آغاز نومبر سے اور گرمی کی ابتدا مارچ سے ہوتی ہے۔ اگست اور ستمبر میں شب کے وقت بھی اتنی اُمس رہتی ہے کہ رات رات بھر نیند نہیں آتی۔ بارش کا اوسط تقریباً دو ڈھائی انچ یا 4.16 سالانہ ہے۔

ریاست خیر پور قدرتی دولتوں (یعنی حیوانات، معدنیات اور نباتاتی پیداوار) کے لحاظ سے کافی مالا مال علاقہ ہے، تقریباً تیرہ ہزار دو سوا ایکڑ رقبے میں جنگلات ہیں۔ ان میں سے دو سو میل میں شکارگاہیں ہیں۔ جنگلات میں ببول اور چھونکر کے درخت زیادہ ہیں، نیز جھاڑ جھنکاڑ بھی بکثرت ہیں۔ دریا کی وادی میں باہن کے جنگل بھی پائے جاتے ہیں جن کی لکڑی پہلے کسی خاص

آخری حاکم جام نظام الدین تھا۔ اس کے عہد حکومت میں شاہ بیگ ارغون نے سندھ پر حملہ کر کے بکھر اور دوسرے قلعوں پر قبضہ کرلیا۔ اس طرح 1521ء میں ارغون خاندان کا دور حکومت شروع ہوا۔ شاہ بیگ ارغون کے جانشین ''شاہ حسن'' نے 32 برس تک سندھ پر حکومت کی۔

سندھ میں مغلوں کی حکومت

اس کے بعد سندھ کی حکومت دو حصوں میں تقسیم ہوگئی جن پر ارغون خاندان کے دو سردار مرزا عیسیٰ خاں اور سلطان محمد قابض ہو گئے۔ مرزا عیسیٰ خاں نے تتہ (ٹھٹھہ) کو اپنا مستقر حکومت بنایا اور سلطان محمد نے بکھر کو حاکم نشین قرار دیا۔ بہت جلد ان دونوں کے درمیان معرکہ آرائیوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ سلطان محمد نے اپنی لڑکی مغل اعظم اکبر کے عقد میں دے دی اس لیے سلطان محمد کے انتقال کے بعد اس کے علاقے مغلیہ شہنشاہیت میں شامل ہو گئے اور اس طرح 1590ء میں سندھ مغل حکومت کا ایک با اختیار صوبہ بن گیا۔ جس پر شاہان دہلی کے مقرر کردہ صوبیدار حکومت کرنے لگے۔ اس زمانہ میں اکبر کی طرف سے سادات امروہہ کے مورث میر سید محمد عدل جو میر عدل کے نام سے مشہور ہوئے سندھ میں قاضی بنا کر بھیجے گئے۔ مغل حکومت کا آخری صوبیدار نواب میاں یار محمد اور اس کا بیٹا نور محمد عباسی کلہوڑا تھا۔

عباسی کلہوڑوں کا سندھ پر قبضہ

جب 1739ء میں نادر شاہ درانی نے ہندوستان پر حملہ کیا تو افراتفری کے زمانہ میں میاں یار محمد نے جو اس سے قبل اپنی خود مختاری کا مدعی ہوگیا اور نادر شاہ کی اطاعت قبول کرلی۔ نادر شاہ نے ادائے خراج کی شرط پر سندھ کا تخت وتاج اس کے سپرد کردیا۔ اس طرح عباسی کلہوڑوں کی حکومت کا دور شروع ہوا۔ یار محمد کے بعد اس کا بیٹا نور محمد عباسی تخت وتاج کا مالک و وارث قرار پایا۔ نور محمد کی دور میں میر شہداد خاں (9) سپہ سالار کے عہدے پر مامور ہوئے اور بلوچستان سے آ کر سندھ میں بس گئے۔

(9) ان کا مفصل حال بعد میں آئے گا۔

لڑائی کا آغاز بندوقچیوں کی گولہ باری سے ہوا۔ میر فتح خاں جو راجپوتوں کی جنگ میں زخمی ہو گئے تھے زیادہ دیر تک حملہ آوروں کی یلغار کا مقابلہ نہ کر سکے اور پیچھے ہٹنے لگے اسی کے ساتھ ساتھ میاں صادق علی خاں کی فوج کی صفوں میں بھی گڑ بڑ پیدا ہو گئی۔ عبداللہ خاں نے اپنی فوج کا حال دیکھ کر بڑی ہمت اور بہادری سے کام لیا اور بلوچوں کو دلیرانہ حملے کا حکم دیا۔ میر سہراب خاں ننگی تلوار لے کر مخالف کے قلب لشکر پر حملہ آور ہوئے بلوچ سپاہیوں نے اپنے بہادر سردار کی پیروی کی اور بروہیوں اور قلاتیوں پر اس زور کا حملہ کیا کہ ان کے پاؤں اکھڑ گئے اور وہ میدان جنگ سے بھاگ نکلے۔ حقیقت یہ ہے کہ بلوچوں کی یہ فتح معرکتہ الآرا اور فیصلہ کن نوعیت کی حامل تھی جس نے میاں عبدالنبی کی طاقت کا خاتمہ کر کے سندھ کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کر دیا۔

شاہی لشکر اور میران ٹالپور کے درمیان تنازع

میاں عبدالنبی بلوچوں کے ہاتھوں شکست کھا کر پھر قلات بھاگ آیا وہاں پہنچ کر اس نے سنا کہ سردار مدد خاں شاہی لشکر لے کر بہاول پور پہنچا ہے اور یہاں بہاول خاں داؤد پوتہ اس کے خوف سے بھاگ گیا ہے۔ میاں نے اپنے قاصدوں کے ہاتھ بہت سے تحفے تحائف شاہی سردار کے پاس بھیجے اور امداد کے لیے درخواست کی۔ میاں نے یہ بھی وعدہ کیا کہ اگر اس کی مدد کی گئی تو وہ شاہی لشکر کی کافی خدمت گزاری کرے گا۔ اس کے ساتھ میاں نے براہ راست بادشاہ کے پاس حصول امداد کے لیے وکیل روانہ کیے اور بہت کچھ اظہار عقیدت اور جاں نثاری کیا۔ بادشاہ نے مدد خاں کو میاں عبدالنبی کی امداد کا حکم دیا۔ سردار مدد خاں شاہی حاکم پا کر سندھ میں آیا اور یہاں عبدالنبی بروہیوں کے لشکر کے ساتھ شاہی فوج سے جا ملا۔ مدد خاں نے میاں عبدالنبی سے تقاضا کیا کہ شاہی فوج کے مصارف کی پابجائی کا بندوبست کیا جائے اور نصف رقم اب اور نصف رقم بعد کو دی جائے۔ میاں نے عذر پیش کیا کہ تمام شاہی خزانہ حیدرآباد کے قلعہ میں ہے۔ جب تک قلعہ فتح نہ ہوگا رقم کی فراہمی دشوار ہے۔ البتہ اس دوران میں مفتوحہ ملک کی تاخت و تاراج سے بہت کچھ حاصل ہو سکتا ہے۔ سردار مدد خاں میاں عبدالنبی کے اس جواب سے مطمئن نہ ہوا اور اس نے میاں کے مقرب سرداروں کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا اور انھیں عتاب دینا شروع کیا تا کہ وہ روپیہ کی نشاندہی کر سکیں لیکن جب اس سے بھی کوئی فائدہ نہ ہوا تو مدد خاں کے سپاہیوں نے ملک میں

اپنے سپاہیوں کو لوٹ مار کے لیے آس پاس کے علاقوں میں بھیج دیا۔ شاہی لشکر کے غارت گروں نے غریبوں پر بہت ظلم کیے اور ہزاروں خاندان تباہ ہو گئے۔ اس بربادی کے آثار مدتوں تک غارت کردہ علاقے میں نظر آتے رہے تھے۔ جب میران ٹالپور کو ان مظالم کی اطلاع پہنچی تو انھیں اپنی صلح کوشی پر بہت افسوس ہوا اور انھوں نے مدد خاں پر حملے کا ارادہ کر کے اپنی فوج کو آگے بڑھایا۔ ہر چند کہ میر فتح خاں کی اب بھی یہ رائے تھی کہ شاہی لشکر سے صلح قائم رکھی جائے۔ لیکن شاہی لشکر کی غارت گری اور ظالمانہ حرکات نے مصالحت کی گنجائش ہی نہ چھوڑی تھی۔ جب مدد خاں کو میروں کی فوج کشی کا علم ہوا تو اس نے بھی خدا آباد سے حرکت کی اور اپنے سپاہیوں کو سمیٹ کر میران ٹالپور کی فوج سے تین منزل پر خیمہ انداز ہوا۔ جب میر عبداللہ خاں کو شاہی لشکر کی نقل و حرکت کا پتہ چلا تو انھوں نے مدد خاں کو ایک نصیحت نامہ لکھا جس کا مضمون یہ تھا۔ کہ اگر چہ ہمارا مصمم ارادہ یہ تھا کہ صلح و معاونت کے قول و قرار پر قائم رہیں گے۔ لیکن تمہارے ہاتھوں بندگان خدا پر جو مظالم ہوئے ہیں انھوں نے ہمارا پیمانہ صبر لبریز کر دیا ہے۔ یاد رکھو کہ تمھیں جلد یا بدیر عادل حقیقی کے دربار میں ان مظالم کی جواب دہی کرنی پڑے گی۔ مدد خاں بہت چالاک اور کینہ پرور شخص تھا اور اس کی کوشش یہ تھی کہ کسی طرح میروں کو دام فریب میں پھنسا کر ان سے اموال و خزائن حاصل کر لے۔ چنانچہ میر عبداللہ کے سخت پیغام کا اس نے بہت نرم جواب دیا اور لکھا کہ ان تمام مظالم کا ذمہ دار میاں عبدالنبی ہے۔ میں ان سے بری الذمہ ہوں۔ میر عبداللہ خاں کو اس نے یہ فریب بھی دیا کہ میں نے بادشاہ سے آپ کی سفارش کی ہے اور اگر آپ ادائے خراج کا وعدہ کریں تو سندھ کا ملک آپ کے سپرد کر دیا جائے۔ میر عبداللہ خاں مدد خاں کے اس فریب کو تاڑ گئے تھے۔ انھوں نے اس کے پیغام و سلام پر کوئی توجہ نہ کی اور جنگ کی تیاریاں جاری رکھیں۔ البتہ میر فتح خاں (جو اوّل ہی سے شاہی لشکر سے مصالحت کے حامی تھے) ناخوش ہو کر مع اپنے سرداروں کے میر عبداللہ کے لشکر سے الگ ہو گئے اور عمر کوٹ کی طرف کوچ کیا۔ مدد خاں کو جب میر فتح خاں کی علیحدگی کا علم ہوا تو اس نے قاصد بھیج کر انھیں اپنے پاس بلایا اور بڑی عزت اور احترام کے ساتھ استقبال کیا۔ چند روز تک تو مدد خاں میر صاحب کے ساتھ ظاہری تعظیم و تکریم برتتا رہا۔ لیکن جب اس کی فوج لوھری کے پاس مقیم ہوئی تو وہ اپنے اصلی رنگ میں آ گیا۔ اس نے میر فتح خاں سے دو لاکھ روپے کا مطالبہ کیا اور ان پر فساد انگیزی کا الزام لگایا۔ میر فتح خاں بیچارے مجبور تھے ناچار مدد خاں کے تمام جابرانہ احکام کی تعمیل کی اور اپنی

کلہوڑوں اور ٹالپوروں کی جنگ

میاں عبدالنبی کی چال سے میر عبداللہ خاں اور میر فتح خاں کا قتل

جب میاں عبدالنبی خاں نے مدد خاں کی قید سے رہائی پائی تو اس نے محسوس کیا کہ سندھ کی زمین اس پر تنگ ہو چکی ہے اور یہ کہ اب اس زمین پر میر عبداللہ خاں کی فوج سے جنگ کرنے کی طاقت باقی نہیں ہے۔ چنانچہ اس نے اپنی کمزوری محسوس کر کے میر عبداللہ خاں سے صلح کی سلسلہ جنبانی شروع کی اور اس مقصد کا پیام دے کر باغ فقیر کو میر صاحب کی خدمت میں بھیجا اور داؤد پوتہ قبیلہ کے سردار محمد بہاول خاں کی خدمت میں بھی بکمال عجز و نیاز پیام بھیجا کہ وہ اس کام میں مدد کریں۔ میاں عبدالنبی نے تحریک صلح میں میر فتح خاں کو بھی اپنا طرف دار بنالیا اور قرآن مجید پر یہ عبارت لکھ کر کہ:

''میں ہمیشہ ٹالپوروں کی خیر خواہی کروں گا اور انھیں کبھی فریب نہ دوں گا''۔

میر صاحب کی خدمت میں بھیج دیا۔ جب میر صاحب کی نظر قرآن مجید پر پڑی تو وہ تعظیماً اٹھ کھڑے ہوئے۔ اسے اپنے سر پر رکھا اور کہا کہ میں عبدالنبی کے قرآن پر یقین کرتا ہوں لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ وہ انجام کار دغا دے گا۔

اس کے بعد انھوں نے میر فتح خاں کو اپنے پاس بلا کر کہا کہ میں قرآن پاک کی حرمت کے پیش نظر میاں عبدالنبی کے قول و قرار پر یقین کرتا ہوں لیکن تم اس کی فطرت سے واقف ہو بہر حال میں قرآن کی حرمت کے لیے اپنا سر کٹانے کو تیار ہوں اور میاں کے پاس جاتا ہوں۔ میرا دل گواہی دیتا ہے کہ میری شہادت کا وقت قریب آ پہنچا ہے۔ میں عنقریب اپنے مرحوم اسلاف سے جا ملنے والا ہوں۔ میرے بعد تم میرے چھوٹے بچوں کی سرپرستی کرنا۔

اس کے بعد میر عبداللہ خاں اپنے سرداروں کے ساتھ میاں عبدالنبی کی لشکر گاہ میں پہنچے۔ میاں عبدالنبی نے بڑے تزک و احتشام کے ساتھ ان کا استقبال کیا اور میر صاحب کو اپنے پہلو میں جگہ دی۔ شام کو میاں عبدالنبی میر صاحب کی قیام گاہ پر بازدید کے لیے آیا اور سابقہ کارروائیوں کے لیے بہت اظہار پشیمانی کیا اور آئندہ کی رفاقت اور دوستی کے لیے مستحکم عہد و پیمان کیے۔ میر

صاحب نے اس کی تمام معذرتوں کو قبول کیا اور پھر کلہوڑہ حکمران کی وفاداری کا دم بھرنے لگے۔ اس کے بعد میاں عبدالنبی میر صاحب کے ساتھ خدا آباد واپس آیا اور بدستور سندھ پر حکومت وفرماں روائی کرنے لگا۔ میر صاحب ہر روز اپنے جانثاروں کے ساتھ میاں کے سلام کو حاضر ہوتے۔ اب عبدالنبی کسی ایسے موقع کی تلاش میں تھا کہ میر صاحب کا خاتمہ کرسکے۔ لیکن میر صاحب اور ان کے رفقا چوکنا تھے اور ہرگز ایسا موقع نہ آنے دیتے تھے۔ ایک روز میاں عبدالنبی نے نئی چال چلی۔ وہ شب کو اپنے ایک معتمد کو ساتھ لے کر میر صاحب کی قیام گاہ پر آیا اور کہنے لگا کہ میرا خیال ہے کہ آپ کو اب تک میرے قول وقرار پر یقین نہیں اور آپ میری طرف سے مشکوک ہیں کہ اتنے محافظ ہمراہ لے کر میرے پاس آتے ہیں۔ لہٰذا میں آج تنہا آپ کے پاس آیا ہوں اگر آپ سمجھتے ہیں کہ میں آپ کو دغا دوں گا اور اپنے عہد پورے نہ کروں گا تو بہتر ہے کہ مجھے اسی وقت قتل کر ڈالیے۔

میاں کی یہ چال کارگر ثابت ہوئی اور میر صاحب نے بہت عذر ومعذرت کے بعد پھر میاں کے ساتھ اپنی وفاداری اور خیرخواہی کا حلف اٹھایا۔ دوسرے روز میر عبداللہ خاں نے اپنے خویش واقارب اور اعزہ کو شہدادپور بھیج دیا اور میر فتح خاں کے ساتھ میاں کے پاس رہ گئے۔ اب میر صاحب تنہا میاں کی خدمت میں حاضر ہونے لگے۔ میاں عبدالنبی کا منصوبہ سو فی صدی کامیاب ہوا اور جب اس نے دیکھا کہ شکار اس کی زد میں ہے تو ایک روز اس نے اپنے چند ملازمین کو حکم دیا کہ کل مسلح ہوکر کچہری کے باہر کھڑے رہنا دوسرے روز جب میر عبداللہ اور میر فتح خاں میاں عبدالنبی کے سلام کو حاضر ہوئے تو میاں کے آدمیوں نے کہا کہ ہتھیار رکھ کر اندر جائیے۔ میر صاحبان بہت حیران ہوئے لیکن انھوں نے خیال کیا کہ شاید میاں ان کی نیک نیتی کا امتحان لینا چاہتے ہیں چنانچہ انھوں نے ہتھیار رکھ دیے۔ ان کے غیر مسلح ہوتے ہی میاں کے ملازمین نے انھیں گرفتار کرلیا اور قید خانے میں پہنچادیا۔ جوں ہی یہ خبر مرزا فقیر کو اور دوسرے بلوچوں کو پہنچی وہ ہتھیار لگا کر وہاں پہنچے اور شاہی آدمیوں پر بندوقوں سے آتش بازی شروع کردی۔ لیکن میاں کے محافظ دستے نے ان پر غلبہ پالیا۔ ادھر دونوں میر صاحبان راضی بہ رضا ہوکر موت کے انتظار میں قرآن کھول کر بیٹھ گئے۔ اتنے میں میاں عبدالنبی کا جلاد ننگی تلوار لیے قید خانے میں داخل ہوا اور عین تلاوت قرآن کے عالم میں اس نے میر عبداللہ کا سر ان کے تن سے جدا کردیا۔ جس سے

قرآن کے تمام ورق خون آلود ہو گئے۔ اس کے بعد میر فتح خاں کو قتل کر ڈالا۔ اس طرح یہ دونوں بے گناہ 1187ء مطابق 1786ء میں میاں کے جذبہ انتقام کا شکار بنے۔

ٹالپوروں کا میاں عبدالنبی پر انتقامی حملہ

میر عبداللہ خاں کے دو کم سن بیٹے تھے ایک میر غلام حسین اور دوسرا میر بہرام خاں۔ میر فتح خاں نے اپنے بعد دو بیٹے چھوڑے میر اللہ یار خاں اور میر ٹھارو خاں۔ جب میر عبداللہ خاں اور میر فتح خاں کی شہادت کی خبر میر سہراب خاں اور دوسرے بلوچوں کو معلوم ہوئی تو ان کے غم و غصہ کی کوئی انتہا نہ رہی۔ میر فتح علی خاں کی صلاح تھی کہ میاں عبدالنبی پر فوراً حملہ کر دیا جائے لیکن میر سہراب خاں نے تامل کا مشورہ دیا اور کہا کہ مناسب یہ ہے کہ ہم اپنے متعلقین اور بال بچوں کو پہلے دین گڑھ کے قلعہ میں پہنچا دیں اور ان کی حفاظت کا مکمل بندوبست کر کے طاقتور حریف کے مقابلے کو نکلیں چنانچہ میر سہراب خاں کے مشورے پر عمل کیا گیا اور بلوچ سردار میر سہراب خاں، میر فتح علی خاں، میر غلام علی خاں، میر اللہ یار خان، میر ٹھارو خان اور باغو فقیر اپنے اہل و عیال کو قلعہ دین گڑھ میں پہنچا کر میاں سے جنگ کرنے چلے۔ اس وقت بلوچ لشکر کی تعداد صرف چھ ہزار تھی۔ ظاہر ہے کہ اس قلیل لشکر کا حکومت کی فوجوں سے مقابلہ کرنا آسان نہ تھا۔ چنانچہ میر سہراب خاں مزید لشکر کی جمع آوری کے لیے روانہ ہوئے اور نندو فقیر نیز دوسرے بلوچ سرداروں کو اپنے ساتھ لے آئے۔

جب عبدالنبی نے سنا کہ میروں کا لشکر جنگ کے قصد سے آرہا ہے تو اس نے بھی اپنے مقام سے حرکت کی۔ محمد حسن کھاوڑ کو ہراولی فوج کا سردار مقرر کیا اور اسے کھاوڑوں کے ساتھ آگے روانہ کیا راج لیکھے کا بیٹا بلاول بھی اپنے آدمیوں سمیت اس سے آملا۔ اللہ بخش جھنجن کا بیٹا غلام حسین بھی اپنے قبیلے کے ساتھ مدد کو حاضر ہو گیا۔ ان کے بعد میں جوسامٹو، دھنگانو، جتوئی، بیروز کلیری اور ببروز ٹالپر قبیلے بھی کمکی دستے لے کر میاں کی فوج سے آملے۔ ان کے علاوہ نومڑیے کھوسا اور افغان لشکر بھی میاں کے شریک کار تھے۔ ان کے سپہ سالار سردار خاں اور اسحاق خاں تھے۔ اس طرح میاں عبدالنبی کے پاس تیس ہزار کا لشکر جمع ہو گیا۔ جیسے ہی ٹالپوریوں کا لشکر میدان میں پہنچا میاں کی فوجوں نے فوراً چاروں طرف سے پوری قوت کے ساتھ حملہ

پورے سندھ میں میروں کی مسلمہ حکومت

کلہوڑا خاندان کے زوال کے بعد میران ٹالپور کا ستارۂ اقبال چمکا اور سندھ کا علاقہ اب ان کے تحت وتصرف میں آیا۔ 1739ء سے جیسا کہ کہا جاچکا ہے سندھ کی حکمرانی کے متعلق یہ دستور چلا آتا تھا کہ کلہوڑا خاندان کے بادشاہ امیر کابل کو مقررہ خراج دیتے تھے اور انھیں امیر کی جانب سے سندھ پر حکومت کرنے کی سند دی جاتی تھی۔ میرانِ ٹالپور نے جب کلہوڑوں کو شکست دے کر سندھ پر قبضہ کیا تو انھیں مقبوضہ علاقہ کا اندرونی نظم ونسق درست کرنے میں کافی توجہ اور وقت صرف کرنا پڑا۔ میاں عبدالنبی نے اپنے عہد حکومت میں عمرکوٹ کا قلعہ مہاراجا جودھپور کو اس امداد کے صلہ میں دے رکھا تھا۔ جو مہاراجا نے میر بجار خاں مرحوم کے قتل کے سلسلے میں میاں عبدالنبی کو دی تھی۔ اس قلعہ کی بازیابی اور قلعہ حیدرآباد کی تسخیر میں میروں کی مصروفیت کے باعث سندھ حکمرانی کے حصول کا مسئلہ تعویق وتاخیر میں پڑ گیا۔ میاں عبدالنبی موقع پاکر سیدھا تیمور شاہ فرماں روائے کابل کے دربار میں فریادی بن کر جا پہنچا۔ میروں کو جب اس واقعے کی خبر ملی تو انھیں بہت تشویش ہوئی اور خیال پیدا ہوا کہ اگر تیمور شاہ نے میاں کو فوجی امداد دے کر سندھ پر چڑھائی کا حکم دے دیا تو پھر شاہی لشکر کا مقابلہ ہمارے امکان سے باہر ہو جائے گا۔ چنانچہ باہم صلاح و مشورہ کرکے میروں نے بھی اپنے وکلا دربار کابل میں روانہ کیے۔ جنھوں نے افغانستان پہنچ کر میروں کی جانب سے میاں عبدالنبی کی تمام حرکات ناشائستہ اور اس کی بدکرداریوں کی روداد لکھ کر تیمور شاہ کے حضور میں پیش کی اور میاں عبدالنبی نے اپنے دورِ حکومت میں جو خون ناحق فریب اور ظلم کیے تھے ان کی تفصیل بادشاہ کے سامنے عرض کی اور میر صاحب کی عرض داشت جس میں بادشاہ کے ساتھ عقیدت وجاں نثاری اور حکومت افغانستان کی خدمت گزاری وفرماں برداری کا اقرار کیا گیا تھا، جب تیمور شاہ کی نظر سے گزری تو اس نے حقائق اور واقعات پر نظر کرکے فیصلہ کیا کہ سندھ کا ملک دو حصوں میں تقسیم کیا جائے اور ایک حصہ میروں کے اور دوسرا حصہ میاں عبدالنبی کے سپرد کر دیا جائے۔ اس فیصلے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے شاہی دربار سے ایک سفیر مقرر کیا گیا۔ نیز میاں عبدالنبی کو بوستاں خاں اور اخلاص خاں کی سرداری میں ایک لشکر دیا گیا تاکہ وہ اپنے حصہ ملک پر قبضہ کر سکے۔

تیمور کا یہ فیصلہ میروں کے لیے اطمینان بخش نہ تھا۔ اس کے معنی یہ تھے کہ ایک چالاک اور سینہ زور دشمن خنجر بکف ان کے پہلو میں بٹھا دیا گیا ہے۔ ان امور پر نظر کر کے میروں کے وکلا کابل میں ٹھہر گئے اور انھوں نے کوشش جاری رکھی کہ تمام ملک سندھ کی فرماں روائی کی سند میروں کو دے دی جائے۔ اِدھر جب میران ٹالپور کو علم ہوا کہ میاں عبدالنبی شاہی فوج کے ساتھ سندھ میں داخل ہونے والا ہے تو چالیس ہزار فوج کے ساتھ روانہ ہوئے اور لوھری میں خیمہ زن ہو گئے۔ جب میاں عبدالنبی کو بلوچ فوج کی نقل و حرکت کا علم ہوا تو وہ جہاں تھا وہیں ٹھہر گیا۔ ابھی میر صاحبان اور میاں عبدالنبی میں مقابلہ ومجادلہ کی نوبت نہ آئی تھی کہ کابل میں حالات کی رفتار میاں کے خلاف ہو گئی اور میر صاحبان کے وکلا تیمور شاہ سے تمام ملک سندھ کی سند حکومت لے کر لوٹ آئے۔ اب عبدالنبی کی ناامیدی کی انتہا نہ رہی۔ آخر کار وہ ہر طرف سے مایوس ہو کر گوشہ نشین ہو گیا اور سندھ میں میر صاحبان کی فرماں روائی مسلّم ہو گئی۔

میر فتح علی خاں کی خود غرضی سے میر سہراب خاں کی بددلی

اس موقع پر میر فتح علی خاں نے جو کہ عمر کے اعتبار سے میر سہراب خاں اور دوسرے میروں کے بزرگ تھے اور سب میر صاحبان ان کا احترام کرتے تھے، خود غرضی سے کام لیا اور 1197ھ مطابق 1783ء میں بڑے تزک واحتشام کے ساتھ خود مسند حکومت پر قدم رکھا جس کے بعد دوسرے میروں کو اپنی کوششوں کا ثمرہ ملنے سے مایوسی ہونے لگی۔ خصوصاً میر سہراب خاں جو درحقیقت ہلانی کی یادگار جنگ کے اصلی فاتح اور سندھ میں ٹالپوروں کی حکومت کے بانی تھے ان کے لیے یہ حق تلفی بہت دلشکنی کا باعث ہوئی۔ مگر انھوں نے بڑی دانائی اور تحمل سے کام لیا اور وقت کی نزاکت کے پیش نظر خاموشی کے ساتھ ناراض ہو کر چلے گئے۔

خیرپور میں میر سہراب خان کی حکومت کا قیام

میر فتح علی خاں سے میر سہراب خاں کی علیحدگی کے اتفاقی حادثہ نے میاں عبدالنبی کی کشت امید کو پھر ہرا کر دیا اور اس نے تیمور شاہ کے دربار میں میروں کی بدنظمی بلوہ خانہ جنگی کی رپورٹ دیتے ہوئے اپنے حق میں ملک سندھ کی حکومت کا قبالہ جاری جاری ہونے کی درخواست پیش

اور اس نے درخواست کی کہ برطانوی لشکر کو سندھ سے گزرنے کی اجازت دے دی جائے اور اس کی ہر امکانی امداد کی جائے۔ اس واقعہ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ انگریز کس طرح طاقت کے بل پر آہستہ آہستہ سندھ کے اندرونی معاملات میں دخیل ہوتے جاتے تھے، اور وہ سندھ کی آزادی کو سلب کرنے کے لیے کس قدر بے چین تھے۔

سندھ میں انگریزوں کا اقتدار قائم ہونے کے اسباب

ایسٹ انڈیا کمپنی کے تجارتی گماشتوں کو سب سے پہلے میاں غلام شاہ کلہوڑہ نے 1170ھ مطابق 1758ء میں ٹھٹھہ اور شاہ بندر میں تجارتی کوٹھیاں قائم کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ لیکن اس کے جانشین میاں سرفراز خاں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے تجارتی گماشتے کی حرکات سے بدظن ہو کر 1777ء میں وہ کوٹھیاں بند کر دی تھیں۔ اس قضیے کے بائیس برس بعد 1799ء میں میر فتح علی خاں نے انگریزی ایجنٹ مسٹر کرو کو پھر کراچی میں قیام کی اجازت دے دی تھی۔ لیکن کچھ عرصہ بعد زماں شاہ فرماں روائے افغانستان کے اصرار پر ان کو حکم دیا تھا کہ وہ اپنا کارخانہ بند کر دیں، کیونکہ انگریزی کمپنی نے اس عذر پر کہ اسے ایک لاکھ روپے کا نقصان ہوا ہے سرکاری مطالبات بھی نہیں کیے تھے۔ جب یورپ میں انگریزوں کی نپولین اعظم سے جنگ چھڑی اور حکومت برطانیہ نے نپولین کے حملہ مصر و شام کے بعد محسوس کیا کہ فرانسیسی ان کے علی الرغم مشرق میں اپنی توسیع اقتدار کے لیے کوشاں ہیں تو انھوں نے میران سندھ سے ایک نئے عہد نامہ کی ضرورت محسوس کی۔ اس زمانہ میں یہ خبر گرم تھی کہ نپولین شہنشاہ فرانس اور حکومت ایران کے درمیان عنقریب دوستانہ معاہدہ ہونے والا ہے۔ ان وجوہ کے پیش نظر 1809ء مطابق 1224ھ میں انگریزوں نے مسٹر اسمتھ کو میران سندھ کے پاس بھیجا، مسٹر بانجو اس کے نائب کے طور پر ساتھ آئے تھے۔ مسٹر اسمتھ اپنی کوششوں میں کامیاب ہوئے اور حکومت برطانیہ نے میر غلام علی خاں فرمانروائے حیدرآباد سندھ اور ان کے دونوں بھائیوں کو ایک عہد نامہ پر دستخط کرنے کے لیے مجبور کیا اور معاہدہ کی رو سے میر صاحبان نے وعدہ کیا کہ وہ فرانسیسیوں کو حدود سندھ میں قدم نہ رکھنے دیں گے۔ اس کے ساتھ یہ بھی طے پایا کہ دونوں حکومتوں کے درمیان سفرا کا تبادلہ ہوگا۔ اسی زمانہ میں میر غلام علی خاں شدید طور سے بیمار ہو گئے۔ گورنر بمبئی نے یہ سن کر میر صاحب کے علاج معالجہ کے لیے ڈاکٹر برنس کو

حیدر آباد بھیجا جس کے علاج سے میر صاحب تندرست ہو گئے، اور انھوں نے ڈاکٹر برنس کو اس حسن خدمت کا امید سے بڑھ کر صلہ دیا۔ درحقیقت برکوچک پاکستان اور ہند میں انگریزوں کی یہی گونا گوں ترکیبیں تھیں کہ جنھیں وہ اپنی توسیع اقتدار کے لیے استعمال کرتے تھے۔ یعنی جہاں ان کے سپاہی کام نہ دے سکتے تھے وہاں وہ اپنے ڈاکٹر بھیجتے تھے اور جہاں ڈاکٹر بے کار ثابت ہوتے تھے وہاں انگریز مبلغ مذہب کا لبادہ اوڑھ کر داخل ہوتے تھے۔ جہاں مذہب کی اپیل مؤثر نہیں ہوتی تھی اس جگہ برطانیہ کے تجارتی گماشتے کاروباری سوجھ کا مظاہرہ کرتے تھے۔ غرض یہ ہے کہ برطانوی مشینری کا ہر پرزہ صرف ایک مقصد کے لیے سرگرم عمل تھا۔ اور وہ مقصد تھا برصغیر کے ہر حصہ میں انگریزی اقتدار کا پرچم لہرانا۔

1831ء میں حکومت برطانیہ نے ڈاکٹر برنس کا بھائی سر الیگزینڈر برنس کو ولایت سے درآمد کردہ گھوڑوں کا تحفہ لے کر مہاراجا رنجیت سنگھ کے پاس دریائے سندھ کے راستے پہنچا اور ان کی نقل و حرکت کی اجازت میر صاحب سے نہ لی جس پر انھوں نے سخت احتجاج کیا لیکن انگریز حکام نے اس احتجاج کو ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا۔

انگریزوں سے والیٔ خیر پور کا معاہدہ

والیان خیر پور انگریزوں سے کسی قسم کا عہد و پیمان کرنے میں ہمیشہ اپنے ہمعصروں پیچھے رہے تھے۔ مگر 1832ء میں واقعات کی رفتار دیکھتے ہوئے والیٔ خیر پور "میر رستم خاں" نے حکومت برطانیہ سے گہری دوستی کی خواہش کا اظہار کیا جس کے بعد حکومت انگلشیہ اور حکومت خیر پور کے درمیان ایک عہد نامہ ہوا جس کی رو سے برطانوی علاقہ کے تاجروں کو مقررہ محصول ادا کرنے کے بعد ان کے علاقہ میں داخل ہونے کی اجازت دے دی گئی۔ لیکن یہ شرط ضرور عائد کی گئی کہ کوئی انگریز مستقل طور پر خیر پور کی شہریت و سکونت کے حقوق نہیں حاصل کر سکتا، انگریزوں نے اس مضمون کا معاہدہ میر رستم خاں والیٔ خیر پور اور میر مراد علی خاں والیٔ حیدر آباد سندھ سے الگ الگ کیا، اور اس اس طرح 1834ء میں مذکورہ بالا عہد ناموں کی رو سے پورے سندھ کے دروازے انگریز تاجروں کے لیے کھل گئے اور انھیں سندھ میں خشکی اور تری کے دونوں راستوں سے بلا روک ٹوک سفر کرنے کی اجازت مل گئی۔

آخری حکم صرف ان ہی کا ہوتا تھا۔ انگریزوں نے سندھ پر عملاً سیاسی غلبہ حاصل کر کے ٹھٹھہ، سکھر اور شکار پور میں اس کشادہ دستی کے ساتھ روپیہ تقسیم کیا کہ تاجر طبقہ اور دوسرے لوگ بھی ان کی معاونت پر کمر بستہ ہو گئے۔ بہر حال ان انتظامات کے بعد برطانوی فوج بخیریت تمام سندھ سے گزر کر کابل روانہ ہو گئی۔ اس نئے بندوبست کا سہرا میجر آؤٹرم (11) کے سر رہا۔ لہٰذا کرنل پاٹنجر کے بجائے وہی حیدر آباد سندھ میں مستقل برطانوی ریزیڈنٹ مقرر کیے گئے۔

خیر پور میں ریزیڈنسی کا قیام

والیٔ خیر پور نے اگرچہ دوسرے میروں کے ساتھ انگریزوں سے کھلے عام ٹکر نہیں لی تھی مگر انگریز ان کی جانب سے بھی مطمئن نہیں تھے۔ اس لیے یہاں کی حکومت بھی حیدر آباد والوں کے عمل کی پاداش میں گیہوں کے ساتھ گھن کا مصداق بن کر رہ گئی تھی۔ چنانچہ انگریزوں نے ریاست خیر پور میں ایک علیحدہ انگریز ریزیڈنٹ مقرر کرنے کی ضرورت محسوس کی اس خدمت کے لیے راس بیل صاحب کا انتخاب ہوا لیکن وہ سال بھر بعد انتقال کر گئے۔

میجر راس بیل کے انتقال کے بعد خیر پور کو بھی حیدر آباد سندھ کے برٹش ریزیڈنٹ کے دائرۂ اختیار میں شامل کر دیا گیا۔ اس کے بعد متحدہ ریزیڈنٹ مقرر کیے گئے۔ آخر میں میجر آؤٹرم ''کچھ'' اور حیدر آباد سندھ میں کپتان ولائٹ ورک کو اپنا نائب مقرر کر کے بلوچستان چلے گئے اور ریاست قلات کے معاملات میں مصروف ہو گئے، کیونکہ اب برطانوی شاطر کی نظریں بلوچستان پر مرکوز تھیں۔

1838ء میں جنرل سر جان، شجاع الملک کو افغانستان کے اورنگ حکومت پر کٹھ پتلی بنا کر سندھ واپس آئے اور حیدر آباد سے گزرتے ہوئے بمبئی روانہ ہو گئے۔ 1255ھ مطابق 1839ء میں میر نور محمد حیدر آباد نے وفات پائی اور بلوچ سرداروں نے ان کے بجائے میر شہداد خاں اور حسین علی خاں کو فرماں روا تسلیم کیا۔ 1942ء میں سر چارلس نیپیئر ریزیڈنٹ مقرر ہو کر سندھ آئے اور میران حیدر آباد سندھ سے ملاقات کر کے سکھر چلے گئے۔ سر چارلس نیپیئر نے سکھر پہنچ کر میر صاحبان ریاست خیر پور سے ملاقات کی۔ جو ان کے یہاں آنے کا اصل مقصد تھا۔

---

(11) میجر آؤٹرام کی یادگار اب تک کراچی میں آؤٹرام روڈ موجود ہے۔

میران خیر پور کی خانہ جنگی

کچھ عرصہ کے بعد میر علی مراد خاں (ولد میر سہراب خاں) کی اپنے بھائی رستم خاں اور بھتیجے میر نصیر خاں (ولد میر مبارک خان) سے تکرار ہوئی (جس کا مفصل حال آگے چل کر لکھا جائے گا) اور میر علی مراد خاں نے دونوں کو شکست دے دی۔ اس خانہ جنگی میں سر چارلس نپیئر نے مری علی مراد خاں کی حمایت کی اور ان کے حق میں فیصلہ کر کے دونوں بھائیوں اور بھتیجے میں معاہدہ کرا دیا۔ میر رستم خاں اس عہد نامہ سے خوش نہ تھے، کیوں کہ وہ اس وعدے سے دست بردار ہونے پر تیار نہ تھے کہ مسند اور دستار کا حق ان کو ہے۔ سر چارلس نیپیئر کے اس طرز عمل سے دوسرے میروں کو سخت صدمہ پہنچا، خیر پور کے بلوچ سردار میر نصیر خاں اور میر محمد حسن خاں حیدر آباد گئے تاکہ میر رستم خاں کو ان کا حق دلانے کے لیے فوج جمع کریں۔ 1843ء میں میر رستم خاں بھی حیدر آباد پہنچ گئے تاکہ بلوچ سرداروں کو اپنا ہمنوا بنائیں۔ جملہ ٹالپور سرداروں نے بجز میر صوبیدار خاں کے ان کا استقبال کیا۔ اس کے بعد تمام میران ٹالپور کی ایک عظیم الشان کانفرنس ہوئی جس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ میر صاحبان کو اپنے تمام باہمی اختلافات ختم کر کے ایک مرکز پر جمع ہو جانا چاہیے اور انگریزوں سے نئے عہد نامے کی درخواست کرنی چاہیے۔ اس فیصلے کے مطابق مرزا یوسف خدمتگار اور میر غلام علی نظامی کو اپنا وکیل بنا کر، سر چارلس نیپیئر کے پاس بھیجا جو اس وقت سیوپن کے قریب کیمپ ڈالے پڑا تھا، اور میران حیدر آباد و خیر پور پر زور ڈال رہا تھا کہ وہ سرکاری انگلشیہ سے نیا عہد نامہ کریں۔ اس عہد نامہ کی رو سے کراچی، ٹھٹھہ، سکھر، بکھر اور روہڑی ہمیشہ کے لیے انگریزوں کو مل جاتے اور روہڑی کے شمال کے علاقے نواب صاحب بہاولپور کو واپس دے دیے جاتے، جو میران خیر پور نے فتح کر لیے تھے۔ میر صاحبان سر چارلس کے ان مطالبات کو جو ان کے لیے سرتا سر تباہ کن تھے قبول کرنے پر تیار نہ تھے۔ لیکن انگریزی دباؤ نے ان کو مجبور کر دیا تھا۔ میر رستم خاں نے براہ راست سر چارلس نیپیئر کو لکھا کہ میں سرکار انگلشیہ کا مقابلہ نہیں کرنا چاہتا، مجھے اپنی خدمت میں حاضر کی اجازت دی جائے۔ سر چارلس نے اس پیغام کا یہ جواب دیا کہ میر رستم خاں کو یہاں آنے کے بجائے اپنے بھائی میر علی مراد خاں کے پاس جانا چاہیے اور ان سے مصالحت کرنا چاہیے۔ ہر چند کہ میر رستم خاں کو یہ امر گوارا نہ تھا تاہم مجبور تھے۔ چنانچہ محض تعمیل حکم میں وہ ”کوٹ

عہد نامہ پر دستخط کر دیے۔ البتہ ان کے دلوں میں انگریزوں کے خلاف نفرت و انتقام کی آگ بھڑک اٹھی۔ حیدر آباد سندھ میں جو انگریز ریزیڈنٹ رہتا تھا میر صاحبان اس کی بڑی خاطر تواضع کیا کرتے تھے اور اس کے عزت و وقار کو ملحوظ رکھتے تھے، لیکن انگریزوں کی مسلسل بدسلوکی نے انھیں اتنا برافروختہ کر دیا کہ ریزیڈنٹ کے ساتھ ان کا سلوک بالکل تبدیل ہو گیا اور وہ اسے طرح طرح سے دق کرنے لگے۔ یہاں تک کہ برٹش ریزیڈنٹ حیدر آباد سندھ کا قلعہ چھوڑ کر چلا گیا۔
جب میران ٹالپور کو معلوم ہوا کہ انگریز ریزیڈنٹ ناراض ہو کر چلا گیا تو انھوں نے اسی روز شب کے وقت جلسہ کیا جس میں سرکار انگلشیہ کے اس خودسرانہ رویہ پر غور کیا گیا، جو وہ بلوچ سرداروں کے ساتھ روا رکھے ہوئے تھی۔ بلوچ سرداروں کی کیفیت اس وقت یہ تھی کہ ''تنگ آمد بہ جنگ آمد''۔ آخر انھوں نے باہمی مشورہ سے قرآن مجید کا حلف اٹھا کر یہ فیصلہ کیا کہ جب تک میر رستم خاں کے ساتھ انصاف نہ کیا جائے گا وہ اپنی تلواریں میان میں نہ رکھیں گے۔ 13 فروری 1843ء کی صبح کو آٹھ ہزار بلوچوں نے انگریز ریزیڈنٹ کی کوٹھی پر حملہ کیا، مسلسل چار گھنٹے تک ریزیڈنسی کے سپاہی حملہ آوروں کا مقابلہ کرتے رہے اور جب تاب مقادمت نہ رہی تو اگن بوٹ میں سوار ہو کر دریا کے راستہ سے سر چارلس نیپیئر کے کیمپ کی طرف روانہ ہو گئے۔
محرم 1260ھ مطابق فروری 1843ء کو سر چارلس نیپیئر اپنے اعلیٰ تربیت یافتہ اور مسلح فوجی دستے کے ساتھ میانی پہنچ گئے۔ جہاں میر صاحبان تیس ہزار سپاہ کے انگریزوں سے لڑنے کے لیے صف آرا ہوئے تھے۔ انگریز لشکر کی تعداد دو تین ہزار سے زیادہ نہ تھی۔ بایں ہمہ جنگ کے بعد سر چارلس نیپیئر نے اپنی قلیل جماعت کے برتر ہتھیار کی مدد سے بلوچوں کے لشکر عظیم کو شکست دے دی اور اس شکست فاش نے سندھ میں میران ٹالپور کے رہے سہے اقتدار کا بھی خاتمہ کر دیا۔ اس ہولناک جنگ میں پانچ ہزار بلوچ اور انگریزی فوج کے 243 جوان اور صرف 14 افسران کام آئے۔ بلوچ لشکر کا تمام توپ خانہ اور سامان جنگ انگریزی سپاہیوں نے چھین لیا اور میر صاحبان کو بھی گرفتار کر لیا۔ دوسرے روز تمام بلوچ سردار سر چارلس نیپیئر کے سامنے پیش کیے گئے اور سر چارلس نیپیئر نے ان کی نظر بندی کے لیے احکام صادر کیے۔ میانی کی فیصلہ کن جنگ میں فتح عظیم حاصل کر لینے کے بعد چارلس نیپیئر حیدر آباد سندھ کی طرف بڑھا اور بغیر کسی وقت کے حیدر آباد پر قبضہ کر کے قلعہ حیدر آباد سے میروں کا تمام خزانہ نکال لیا۔ اس جنگ میں

میر علی مراد خاں کو خیر پور کا رئیس تسلیم کیا گیا تھا اور ان کی ریاست میں میر رستم خاں کا علاقہ بھی شامل کر دیا گیا تھا، جس کی نشان دہی میر علی مراد خاں نے کی تھی۔ سر چارلس نیپیئر کو اپنی روانگی سے قبل خفیہ طور پر اس بات کا پتہ چلا کہ میر علی مراد خاں نے اس معاہدہ میں جو کہا جاتا ہے کہ ان کے اور میر رستم خاں کے درمیان کوٹ ڈیجی میں لکھا گیا تھا بطور خود مزید علاقوں کا اضافہ کر لیا ہے، جن پر ان کا کوئی حق نہیں۔ چنانچہ 1850ء میں اس واقعہ کی تحقیقات کے لیے ایک کمیشن مقرر کیا گیا۔ اس وقت مسٹر برنکل سندھ کے چیف کمشنر تھے۔ کمیشن نے اپنا فیصلہ میر علی مراد خاں کے خلاف نافذ کیا۔ کمیشن کا تحریری فیصلہ آخری احکام کے لیے ایسٹ انڈیا کمپنی کے بورڈ آف ڈائریکٹرز کے پاس ولایت بھیج دیا گیا۔ اس زمانے میں بورڈ آف ڈائریکٹرز ہی ہندوستانی مقبوضات کا حکمران اعلیٰ تھا۔ برکوچک میں انگریز گورنر جنرل ان کے فیصلوں کو عملی جامہ پہنایا کرتے تھے۔ 1851ء میں کمپنی کے نظما نے یہ حکم صادر کیا کہ میر علی مراد خاں کے درجہ میں تنزل کر دیا جائے اور ریاست کے حدود میں اسی قدر علاقہ باقی رکھا جائے جتنا کہ پہلے تھا۔ مابقا علاقوں کو ملحقہ برطانوی مقبوضات میں شامل کر دیا جائے۔ اس حکم کے نتیجہ میں تقریباً پانچ ہزار چار سو بارہ میل کا وسیع علاقہ ریاست خیر پور کے حدود سے خارج ہو گیا اور کنڈیارو پرگنہ نوشہرہ، شاہ بیلہ کوچک، سعید آباد، اباوڑہ، میر پور، اروڑا، بکھر، شکار پور اور پرگنہ بھیھوا پر انگریز حکام نے قبضہ کر لیا۔ کمپنی کے نظما (بورڈ آف ڈائریکٹرز) کے اس غیر متوقع حکم کو خود سندھ کے انگریز افسروں نے ظلم شدید سے تعبیر کیا اور حکمران خیر پور (میر علی مراد خاں) کو مشورہ دیا کہ وہ اس حکم کے خلاف اپیل کریں۔ میر صاحب اگرچہ کمپنی کے سلوک سے بہت مایوس تھے تاہم اپنے انگریز دوستوں کے اصرار پر ولایت گئے اور پارلیمنٹ کے ایک ممبر مسٹر ائزک بٹ کی امداد حاصل کی۔ بایں ہمہ حکمران خیر پور کو اپنے مقصد میں ناکامی ہوئی اور کمپنی نے سابقہ حکم کو برقرار رکھا۔ میر صاحب کے ساتھ صرف اتنی رعایت کی گئی کہ ان کی پندرہ توپوں کی سلامی مقرر کر دی گئی اور پھر ان کی تعداد انیس ہو گئی۔ علاوہ ازیں انھیں خیر پور کا بااختیار حکمران مان لیا گیا اور انگریز حکام کو خیر پور کے اندرونی معاملات اور نظم و نسق میں مداخلت سے روک دیا گیا۔ یہ رعایتیں میر صاحب کی توقع سے بہت کم تھیں، مگر کیا کرتے۔ ناچار انھیں پر قانع ہو کر خیر پور واپس آئے۔ 1866ء میں میر صاحب کو سرکار انگلشیہ نے ایک نئی سند حکومت عطا کی جس کی رو سے انگریزوں نے یہ بات تسلیم کر لی کہ ان کے بعد بروئے شریعت اسلامیہ جو

کے بعد اس شرکت کو ختم کر کے براہ راست حکومت افغانستان سے خط کتابت کرنے لگے۔ مگر کسی وقت آپ نے دوسرے میر حکمرانوں کے ساتھ تعاون کرنے سے گریز نہیں کیا۔ چنانچہ جب 1803ء میں شجاع الملک کی فوج سے میر غلام علی خاں کا مقابلہ شکار پور میں ہوا تو میر سہراب خاں نے بھی ان کی مدد کے لیے اپنی فوج بھیجی۔ جب امیر بہاول پور پر فوج کشی کی ضرورت پڑی تو اس موق پر بھی میر سہراب خاں سب سے پیش پیش رہے۔ جب 1814ء میں شجاع الملک بھاگ کر سندھ آئے تو میر سہراب خاں کی حکومت نے بھی دوسرے ٹالپوروں کے ساتھ ان کے لیے لشکر جمع کیا۔ 1817ء میں جب مہاراجا رنجیت سنگھ کے سندھ پر حملہ آور ہونے کی افواہیں گرم ہوئیں تو اس وقت بھی میر سہراب خاں کے ایما سے میر رستم خاں نے خیر پور کے لشکر کی جمع آوری کے لیے احکام صادر کیے۔ غرض کہ وہ ہر موقع پر اپنی انفرادیت کے ساتھ اجتماعیت کا بھی پاس ولحاظ رکھتے تھے، جس سے ان کی فطری حاکمانہ صلاحیتوں کا پتہ چلتا ہے۔

قلعہ احمد آباد (کوٹ ڈیجی) کی تعمیر

میر سہراب خاں جب 1803ء میں خیر پور کو (جو اس وقت سہراب خاں پور کہلاتا تھا) اپنا دارالخلافہ بنا کر تخت حکومت پر جلوہ افروز ہوئے تو سب سے پہلے انھیں اپنے علاقے کے تحفظ اور بقا کی فکر دامنگیر ہوئی۔ جسے ان کی بیدار مغزی اور دور اندیشی کا ایک محکم ثبوت خیال کرنا چاہیے۔ انھیں میاں عبدالنبی اور اس کے بہی خواہوں کی جانب سے ہر وقت خطرہ لاحق تھا اس لیے انھوں نے خیر پور سے پندرہ میل کے فاصلہ پر ایک غیر مفتوح قلعہ تعمیر کرنے کا پختہ ارادہ کرلیا۔ چنانچہ قصبہ احمد آباد میں (جو آج کل کوٹ ڈی جی کہلاتا ہے) پہاڑی کے اوپر تقریباً گول دائرہ کی صورت میں ایک قلعہ تعمیر ہوا۔ چاروں طرف فصیل اور پہاڑیوں پر مورچے بنائے گئے۔ خصوصیت اس قلعہ کی یہ تھی کہ دشمن قلعہ کو فتح کرنے کے لیے چاہے کسی بھی جانب سے گولہ باری کرے مگر گولہ قطعہ کے اندر نہ پہنچ سکے۔ یہ قلعہ آج بھی کوٹ ڈیجی میں موجود ہے اور اپنے زمانہ کے اَن پڑھ انجینئروں کے کمال فن کا ثبوت دے رہا ہے، اس قلعہ میں بڑی بڑی توپیں تھیں جن میں تین خاص طور پر مشہور تھیں۔ ایک بریم توپ جسے بادشاہ پرتگال لایا تھا اور روہڑی کے قریب دریائے سندھ پر چھوڑ گیا تھا۔ میر سہراب خاں اسے دو ہاتھیوں کے ذریعہ گھسیٹ کر احمد آباد

سن کر آخر الذکر کے حق میں فیصلہ کیا لیکن ابھی اس فیصلہ کو عملی جامہ نہ پہنایا جا سکا تھا کہ راس بیل صاحب کو کوئٹہ بلوچستان کی طرف جانا پڑا اور میجر آؤٹرم ان کے جانشین ہوئے۔ راس بیل صاحب کوئٹہ جا کر مر گئے اور میجر آؤٹرم نے انھیں کے فیصلے کو برقرار رکھا اور اپنی رپورٹ گورنر جنرل کے پاس بھیج دی۔ گورنر جنرل نے اس فیصلہ پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔ لیکن ابھی طرفین کو اس فیصلہ کی اطلاع نہیں ملی تھی کہ اس طرف میر نصیر خاں اور میر علی مراد خاں اپنے اپنے فوجی دستے لے کر قسمت آزمائی کے لیے نکلے۔ ستمبر 1842ء میں نونہار کے قریب دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا جس میں میر نصیر خاں نے شکست کھائی۔ آخر صلح کی گفتگو شروع ہوئی اور میر علی مراد خاں کو نو دیہات دے کر صلح کر لی گئی۔ ان میں سے سات دیہات میر رستم خاں کے اور دو دیہات ماتھیلہ اور دادلوٹے میر نصیر خاں اور میر محمد خاں کے تھے۔ میر رستم خاں کو اس جنگ کے نتیجہ میں سات دیہات سے اس لیے ہاتھ دھونا پڑا کہ اس جنگ برادران میں میر نصیر خاں کی طرف سے لڑتے ہوئے ان کا لڑکا میر غلام محمد اسیر ہو گیا تھا۔ اس کی آزادی کی خاطر میر رستم خاں کو مجبوراً یہ جرمانہ ادا کرنا پڑا۔ میر رستم کے دیوان فتح محمد خاں غوری نے دونوں کے درمیان صلح کرا دی۔ یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ میر علی مراد خاں اس دیوان سے سخت ناراض تھے اور وہ کوٹ ڈیجی میں میر علی مراد خاں کے دربار میں حاضر ہوا اور اپنی اور میر رستم خاں کی طرف سے بہت کچھ کہا سنا۔ آخر میر علی مراد خاں مصالحت پر رضامند ہو گئے اور خیر پور آ گئے لیکن میر صاحبان کے دل اب تک صاف نہ ہوئے تھے۔ بات بات پر طرفین کے ہمراہی تلواریں نیام سے نکال لیتے تھے اور خانہ جنگی شروع ہو جاتی تھی۔ میر رستم خاں نے بطور خود کوشش کی کہ وہ چھوٹے بھائی سے کوئی مصالحت کر لیں، لیکن ناکام رہے۔ آخر میر علی مراد خاں نے علی حسین اپنے وکیل کو انگریز پولیٹیکل ایجنٹ کپتان براؤن کے پاس بھیجا کہ وہ ثالث بن کر اس نزاع کا تصفیہ کر کے ہر فریق کی حدود ملکیت کا تعین کر دیں، لیکن انگریز ریزیڈنٹ بھی میر صاحبان کی خانہ جنگیوں اور طوائف الملوکیوں سے عاجز آ چکا تھا۔ اس نے صاف جواب دے دیا کہ یہ کام آپ کا اور میر رستم خاں کا ہے۔ آپ کو خود آپس میں صلح کر لینی چاہیے۔ جاگیر اور گھریلو جھگڑے کے علاوہ بعض دوسرے گھریلو اور خاندانی تنازع بھی آپس کے ملکی قضیوں پر اثر انداز ہوتے تھے۔ مثلاً میر رستم خاں نے اپنی لڑکی میر علی مراد کے صاحبزادے میر سہراب خاں سے منسوب کر دی تھی، شادی ہونے والی تھی کہ اس سال اگست میں میر سہراب خاں

جواں مرگ مر گیا۔ میر علی مراد خاں نے خواہش کی کہ لڑکی اس کے دوسرے بیٹے میر شہنواز خاں کو بیاہ دی جائے مگر میر رستم خاں اس رشتہ پر راضی نہ ہوئے اس سے میر علی مراد خاں کو رنج پہنچا۔ تکرار کی ایک نئی شکل پیدا ہوئی جس کی صورت یہ تھی کہ میر رستم خاں کی تین بیگمات کے بطن سے آٹھ فرزند تھے۔ ایک بیگم کی اولاد میر محمد حسین خاں، میر علی اکبر خاں، میر مرید حیدر خاں۔ دوسری بیگم کے بطن سے میر علی مراد خاں، میر شیر محمد خاں، میر علی بخش خاں اور میر غلام محمد خاں۔ تیسری بیگم کے بطن سے میر دوست محمد جو محراب پور میں رہتے تھے۔ میر رستم خاں نے ان میں سے اپنے بڑے بیٹے میر محمد حسین کو اپنا ولی عہد بنانا چاہا اور بلوچ سرداروں سے اس امر کو منظور کرا لیا۔ رستم خاں کے دوسرے بیٹوں نے سنا تو وہ بہت برہم ہوئے اور انھوں نے تقرر ولی عہد کی سخت مخالفت کی۔ اس موقع پر میر علی مراد خاں نے اپنے ان بھتیجوں کی حمایت کی جو تقرر ولی عہد کے مخالف تھے۔ ان سب واقعات نے مل جل کر میر رستم خاں اور میر علی مراد خاں کے دلوں میں کشیدگی اور بدمزگی کی دیواریں کھڑی کر دی تھیں۔

نونہار کی جنگ اور عہد نامے

انھیں تکراروں اور جھگڑوں کے سبب آخر کار نونہار کی جنگ واقع ہوئی جس میں میر علی مراد خاں کے بارہ ہمراہی میر رستم خاں، میر نصیر خاں کے ساٹھ سپاہی قتل ہوئے اور لڑائی میں میر نصیر خاں کا بھائی میر محمد علی خاں جو ہر اول کی فوج زخمی ہو کر میدان جنگ سے بھاگ گیا اور اپنے پچاس ساٹھ سپاہیوں کے ساتھ ٹیلوں کی آڑ میں چھپ گیا۔ وہاں میر علی مراد خاں کے سپاہیوں نے اسے گھیر لیا۔ میر محمد علی خاں زخموں اور بھوک پیاس کے سبب ایسا بے بس ہو گیا کہ اس نے اپنے آپ کو میر علی مراد خاں کے سپرد کر دیا۔ جب میر رستم خاں کو محمد علی خاں کی گرفتاری کا حال معلوم ہوا تو انھوں نے اپنے لڑکے میر مراد علی خاں کو اپنی مہر دے کر میر علی مراد خاں کی لشکر گاہ میں بھیجا اور یہ پیغام بھی بھجوا دیا کہ آپ جو فیصلہ کریں مجھے منظور ہے میری مہر حاضر ہے۔ میری منظوری ثبت کر دیں۔ میر علی مراد خاں نے بھائی کا یہ پیغام سن کر جواب دیا کہ نزاع و فساد کا سبب صرف یہ ہے کہ والد مرحوم نے تقسیم کی رو سے جو علاقہ مجھے عطا فرمایا تھا میری کم سنی کے زمانہ میں اس کی بعض جاگیروں پر ناجائز قبضہ کر لیا گیا۔ یہ دیہات جن پر میرا حق مسلم ثابت ہے مجھے واپس کر دیے جائیں تو پھر کوئی

انھیں دے دی جائے۔ لیکن چارلس نیپیئر نے اس درخواست کو مسترد کر دیا اور کہا کہ میران تالپور کو یہ غلط فہمی ہے کہ انگریز ریگستان میں ان کا تعاقب نہیں کر سکتے لہٰذا اس قلعہ کو مسخر کرنے کے لیے انگریز فوج ہی جائے گی۔ جنرل کو معلوم ہوا کہ میروں کا ایک بہت بڑا لشکر ''ڈنگی'' میں جمع ہے اور لاڑکانہ سے بھی پندرہ ہزار آدمی ان کی امداد کے لیے آئے ہیں تاکہ سکھر پر حملہ کر کے اسے انگریزوں سے چھین لیں۔ نیز دو ہزار آدمی تھر ریگستانی قلعہ امام گڑھ اور اتنی ہی تعداد میں قلعہ شاہ گڑھ میں جمع ہیں جو جیسلمیر کی حدود میں واقع ہے۔ جنرل (چارلس نیپیئر) نے یہ خبریں سن کر ایک لمحہ بھی ضائع نہ کیا اور پانچ سو سپاہیوں کا ایک دستہ اور پندرہ اونٹوں کے ذریعہ دو توپیں کھینچ کر ایک میل ریگستان میں نکل گیا۔ ان سپاہیوں کے ساتھ پندرہ روز کا کھانا اور چار روز کا پانی تھا۔ انگریز فوج 5 جنوری 1843ء کو قلعہ امام گڑھ کی تسخیر کے لیے روانہ ہوئی اور 13 جنوری کو وہاں پہنچ گئی۔ راستہ میں انگریزی دستہ کے سپاہیوں کو بڑی تکلیفیں اٹھانا پڑیں۔ لیکن اس کا نعم البدل یہ ہوا کہ قلعہ پہلے ہی حملہ میں مسخر ہو گیا۔ جنرل نے توپوں کی گولہ باری سے قلعہ کو منہدم کر دیا۔ میروں کا لشکر قلعہ سے پہلے ہی نکل گیا تھا۔ باقی نے کچھ دیر مقابلہ کیا۔ آخر بھاگ کھڑے ہوئے۔ ہر چند کہ قلعہ نئی تقسیم کی رو سے میر علی مراد خاں کے حصہ میں آیا۔ اور وہ چارلس نیپیئر کے ساتھ قلعہ کی تسخیر کے لیے آئے تھے۔ با ایں ہمہ جنرل نے اس کا انہدام مناسب سمجھا تاکہ اگر میر علی مراد بھی کبھی سرتابی کریں تو اس قلعہ کو برطانوی فوج کے خلاف استعمال نہ کر سکیں۔

نئے عہد نامہ کی تکمیل پر انگریزوں کا اصرار

امام گڑھ کی تسخیر کے بعد چارلس نیپیئر مع اپنے سپاہیوں کے ''ڈنگی'' کی طرف روانہ ہوا۔ اس کے قبل میجر آؤٹرم کو خیر پور بھیج دیا گیا، تاکہ وہ منادی کرادیں کہ 25 جنوری کو تمام میر صاحبان بذات خود عہد نامے کی تکمیل کے لیے حاضر ہوں یا اپنے وکلا روانہ کریں۔ راہ میں میجر آؤٹرم کو میر رستم خاں ملے جو اپنے بھتیجوں کی امداد کے لیے ''ڈنگی'' جا رہے تھے۔ آؤٹرم نے انھیں صلاح دی کہ وہ خیر پور میں 25 جنوری کو چارلس نیپیئر سے ضرور ملاقات کریں اور عہد نامہ پر دستخط کر دیں۔ غالباً میر رستم خاں کو چارلس نیپیئر کی فوجی نقل و حرکت اور قلعہ امام گڑھ کے انہدام کا علم نہ تھا تاہم انھوں نے آؤٹرم سے وعدہ کر لیا کہ وہ 25 جنوری 1843ء کو خیر پور حاضر ہوں گے۔ لیکن یہ وعدہ

میر صاحب نے یہ سفارش نہ مانی۔ جب کسی قدر سخت لہجہ میں میر صاحب کو لکھا گیا تو انھوں نے شیخ علی حسین کو بحال کر دیا لیکن دیوان کا منصب نہ دیا۔

بلوچستان کے حدود پر جو قبائلی مری جھکرانی، بگٹی اور ڈوبکی وغیرہ آباد تھے۔ انھوں نے لوٹ مار کو اپنا پیشہ بنالیا تھا اور ان قبائل کا ساز باز خان قلات اور مہاراجہ ملتان سے تھا۔ ان غارت گروں میں سب سے زیادہ طاقتور اور مہیب ڈوبکی قبیلہ کا سردار بیجا خان تھا۔ بیجا خان سندھ کی برطانوی حدود میں برابر لوٹ مار کے لیے دھاوے کرتا رہتا۔ چنانچہ ایک مرتبہ اس نے اپنے دھاوے میں چالیس آدمی قتل کیے اور گاؤں کے گاؤں لوٹ کر ویران کر دیے۔ اب چارلس نیپیئر نے بیجا خان کی تادیب ضروری سمجھی اور ایک چھوٹا سا لشکر پولاجی بھیجا جہاں بیجا خان کی گڑھی واقع تھی۔ بیجا خان نے بڑی دلیری سے انگریزی سپاہیوں کا مقابلہ کیا اور ان کو مار کر بھگا دیا۔ یہ خبر سن کر چارلس نیپیئر نے ارادہ کیا کہ وہ خود ایک تعزیری مہم لے کر جائے۔ لیکن بعد کو یہ ارادہ فسخ کر دیا اور ولی چانڈیہ کو اس کی روک تھام پر مامور کر دیا مگر بیجا خان اس کے بس کا نہ تھا۔ دوسری بار حملہ کر کے اس نے دو سو آدمی قتل کر دیے اور پچاس زخمی کیے اور بہت سامان و اسباب لوٹ کر چلا گیا۔ اس واقعہ نے چاروں طرف بیجاخان کے نام کی دھاک بٹھادی اور لوگ بیجا نام سے کانپنے لگے، ولی چانڈیہ نے ان دھاووں میں بیجا خان کے ایک رفیق نوبت خان کو گرفتار کر لیا جسے پھانسی کی سزا دی گئی۔

چونکہ بیجا خان سندھ کے امن و امان کے لیے مستقل خطرہ بن گیا تھا اس لیے 1845ء میں چارلس نیپیئر نے اس سے لڑنے کے لیے انفنٹری کے دو ہزار سپاہی اور کیولری (سوار) کے بارہ سو سواروں کا لشکر مرتب کیا جس کے ساتھ 23 توپیں، دو ہاتھی بھی تھے۔ اس لشکر کی امداد کے لیے میر علی مراد خاں بھی بلائے گئے تاکہ ان سے مدد بھی لی جا سکے اور ان کی نگرانی بھی کی جا سکے۔ درحقیقت چارلس نیپیئر کو یہ بدگمانی پیدا ہو گئی تھی کہ میر صاحب بھی دوسرے بلوچ سرداروں کی طرح انگریزوں کے خلاف دل میں نفاق رکھتے ہیں۔

انگرزوں کی یہ تادیبی فوج 13 جنوری کو سکھر سے شکار پور پہنچی جہاں سے ولی چانڈیہ بھی مع اپنے ہمراہیوں کے لاڑکانہ سے آ کر ان سے ملا۔ میر صاحب کو ہدایت کی گئی کہ وہ اپنی ریاستی سپاہ کے ساتھ بعد میں اس لشکر سے آ کر مل جائیں۔ جنرل چارلس نیپیئر اس تادیبی فوج کو لے کر شکار پور سے روانہ ہوا اور خان گڑھ ہوتا ہوا شاہ پور پہنچا جہاں بیجا خان مع اپنے ہمراہیوں کے صف

آرا تھا۔ اس کی فوج کا دوسرا حصہ اچ میں پڑا تھا۔ انگریزی سپاہ نے اس کے تین ہزار بیل پکڑ لیے اور اس کے بعد ہلہ کر کے پولاجی، شاہ پور اور اچ پر قبضہ کرلیا گیا۔ دشمن کے ہزاروں آدمی اور رسد کے بہت سے ذخیرے انگریزوں کے ہاتھ لگے۔ اسی درمیان میں میر صاحب بھی خیر پور کے فوجی دستے لے کر مدد کے لیے پہنچ گئے، بیجا خان کے بہت سرداروں نے چارلس نیپیئر سے حاضری کی اجازت مانگی۔ جنرل نے جواب میں کہلا بھیجا کہ جب تک خود بیجا خان حاضر ہو کر اپنی تقصیرات کی معافی نہ مانگے اور حلف وفاداری نہ اٹھائے برطانوی فوج اپنی کارروائی جاری رکھے گی۔ جنرل نے یہ بھی دھمکی دی کہ اگر بیجا خان نے غیر مشروط طور پر ہتھیار نہ ڈالے تو ان تمام قیدیوں کو قتل کر ڈالا جائے گا جو قتل و غارت گری کے مجرم سمجھے جاتے ہیں۔ اور حقیقت میں ڈاکو اور قاتل بھی ہیں۔

کچھ عرصہ کے پس و پیش کے بعد آخر بیجا خان ڈبکی، اسلام خان بگٹی، دریا خان جھکرانی اور دوسرے سردار قرآن ہاتھوں میں اٹھا کہ انگریزی کیمپ میں داخل ہو گئے۔ جنرل چارلس نیپیئر نے انھیں ہدایت کی کہ وہ دریا کی دوسری طرف منتقل ہو جائیں اور وہاں رہائش اختیار کرلیں۔ یہ سردار مشورے کی غرض سے اپنے اپنے قبیلہ سے چلے گئے۔ باقی تو واپس آ گئے لیکن بیجا خان بھاگ گیا مگر وہ پھر گرفتار کرلیا گیا۔ انگریز حکام نے دریا کی مغرب کی طرف اسے گزر اوقات کے لیے اراضیات دے دیں اور میر علی مراد خاں کو اس کی نگہداشت پر مامور کیا۔

برطانیہ کی نگاہ میں میر علی مراد خاں کا وقار

اگر چہ درمیان میں کچھ عرصہ کے لیے چارلس نیپیئر میر علی مراد خاں سے بدگمان ہو گیا تھا۔ تاہم میر صاحب نے جنگ میانی اور سرحدی لڑائیوں میں انگریزوں کی جو امداد کی تھی اس نے سرکار انگلشیہ کی نظروں میں ان کی وقعت کو بہت بڑھا دیا۔ علاوہ ازیں خود انگریز حکام کی پالیسی یہ تھی کہ مغربی و شمالی ہندوستان میں اپنے چند مضبوط حلیف پیدا کیے جائیں۔ اس پالیسی کے پیش نظر والی ریاست خیر پور، امیر بہاول پور، راجا جیسلمیر کے ساتھ اضافہ تعلقات ضروری تھا انھیں وجوہ کے پیش نظر روہڑی کے شمالی علاقہ (جو میر رستم خاں کی جاگیر میں تھا) کا بہت بڑا حصہ میر علی مراد خاں کو بطور انعام دے دیا گیا۔ امیر بہاول پور کو سبزل کوٹ اور بھنگ بارہ کے پرگنے واپس کر دیے گئے جو میران ٹالپور نے ان سے چھین کر باہم تقسیم کر لیے تھے اور مہاراجہ جیسلمیر کو شاہ گڑھ، گینیہ اور بیکی

تھر کے علاقے بخش دیے گئے۔

میر رستم خاں کا علاقہ میر علی مراد خاں کو دینے کی جنرل نیپیئر کی طرف سے تجویز

میر علی مراد خاں انگریزوں کی اس تنگ دلانہ قدر افزائی سے جو روہڑی کا شمالی علاقہ بطور انعام انھیں دیے جانے کی صورت میں کی گئی خوش نہ ہوئے۔ کیونکہ از روئے عہد نامہ (جو میر رستم خاں نے ان سے کیا تھا) میر صاحب زیادہ علاقوں کے مستحق تھے۔ ان کی کوشش یہ تھی کہ قرآن مجید کی ورق پر میر رستم خاں نے جتنے علاقے میرے نام لکھے ہیں وہ سب مجھے واپس کیے جائیں۔ اس غرض سے انھوں نے ایک اپنا وکیل بھی گورنر جنرل کے پاس بھیجا۔ اس وقت جنرل چارلس نیپیئر کو میانی کی جنگ درپیش تھی اور اتنے بڑے علاقوں کی مدافعت اس کے امکان سے باہر تھی لہٰذا اس نے عارضی طور پر ان علاقوں کی نگہداشت میر علی مراد خاں کے سپرد کر دی۔ میر صاحب نے فقط ان علاقوں کے نظم و نسق پر ہی اکتفات کی بلکہ سبزہون کے برطانوی ضلعوں کے انتظام میں بھی دخیل ہو کر ان کا لگان وصول کرنا شروع کر دیا۔ آخر جنگ کے بعد 1845ء میں جنرل کی سفارش پر ایسٹ انڈیا کمپنی اور میر صاحب کے درمیان ایک ''حد بندی'' کا مسودہ تیار کیا گیا۔ اس مسودے کی رو سے میر صاحب کو رئیس خیر پور شمار کیا گیا اور ان کی ریاست میں وہ اضلاع جو جنگ میانی سے قبل ریاستی حدود میں شامل تھے شامل کیے گئے۔ نیز جو علاقے میر رستم خاں کی ملکیت میں تھے ان پر میر صاحب کا حق تسلیم کیا گیا۔ ان جاگیرات کی تفصیل یہ ہے (1) کوٹھیرا اچھورا تھر یجا، (2) نوشہرہ، (3) کنڈیارو، (4) لاہو گاگن، (5) خیر پور کا شہر، (6) روہڑی، (7) رن یا تھر، (8) نارہ، (9) شاہ گڑھ سردا گڑھ اور دوسرے قلعے، (10) اباوڑہ، (11) خیر پور ڈھرکی، (12) امام واہ، (13) شکار پور کا کچھ حصہ، (14) موغلی، (15) پیچ اور مزدوکار، (16) روپاہ، (17) بڑوکا اور میر نصیر خاں کا ملک، (18) میر پور، (19) ماتھیلہ، (20) مہرکی وغیرہ۔ ان علاقوں میں نمبر 6، 10، 11، 12، 18، 19 اور نمبر 20 میر علی مراد خاں کو واپس کر دیا گیا۔

جنرل چارلس نیپیئر نے کمپنی اور رئیس خیر پور کے درمیان نئے معاہدہ کا مسودہ اپنی سفارش کے ساتھ گورنر جنرل کی خدمت میں بھیج دیا۔ گورنر جنرل کے فیصلہ میں تاخیر ہوئی۔ میر صاحب کو شبہ ہوا تھا کہ شاید چارلس نیپیئر نے کچھ اعتراضات کیے ہیں جن کے باعث گورنر جنرل کے فیصلہ

کمیشن کی تحقیقات میں صرف ہوگیا۔ آخر کمیشن کے ارکان اس نتیجہ پر پہنچے کہ عہد نامہ میں واقعی تحریف ہوئی ہے اور اس طرح کئی علاقے ریاستی حدود میں شامل کر لیے گئے ہیں۔

عہد نامہ نونہار کی تحریف کے مقدمہ میں میر علی مراد کے خلاف فیصلہ درجہ میں تنزل اور بعض علاقوں کی ضبطی

31 جنوری 1852ء کو گورنر جنرل سے اجازت لینے کے بعد سندھ کے کمشنر سر بارٹل فریر (جو پرنگل صاحب کے جانشین تھے) نے اعلان کیا کہ ہر گاہ سرکار انگلشیہ کو یقین ہوگیا ہے کہ سندھ کے انگریزی اضلاع کے کچھ علاقے ایک جعلسازی کے سبب ریاست خیر پور میں شامل کر لیے گئے ہیں جن پر رئیس خیر پور کا کوئی استحقاق نہیں ہے۔ نیز یہ بات بھی پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ ''عہد نامہ نونہار'' کا ایک ورق قرآن مجید سے پھاڑا گیا ہے اور اس کے بجائے دوسرا ورق لگا دیا گیا ہے، جس سے معاہدہ مذکور کی نوعیت بدل گئی ہے۔ ان وجوہ کی پیش نظر سرکار انگلشیہ اس چیز کو ضروری سمجھتی ہے کہ رئیس خیر پور کے درجہ میں تنزل کر دیا جائے اور جو علاقہ انھیں اپنے والد میر سہراب خاں سے ورثہ میں ملا ہے صرف وہی ان کے قبضہ میں چھوڑا جائے اور باقی علاقہ ضبط کر کے انگریزی اضلاع میں شامل کر دیا جائے۔ اس حکم کی تعمیل میں جو علاقے برطانوی مقبوضات میں شامل کیے جائیں گے ان کے باشندوں کو یقین دلایا جاتا ہے کہ ان کے حقوق و مفادات کا تحفظ کیا جائے گا۔

اس کے ساتھ میر سہراب خاں کے علاقہ جات کی تفصیل بھی پیش کی گئی تھی۔ ان کے تصرف میں بیس لاکھ انتالیس ہزار روپیہ سالانہ آمدنی کی ریاست تھی ریاست کے چار حصے کر کے 1828ء میں انھوں نے اپنے تین بیٹوں میں تقسیم کر دیے، ان چار حصص میں سے میر رستم خاں، میر مبارک خاں اور میر علی مراد خاں کو ایک ایک حصہ ملا۔ رہا چوتھا حصہ وہ دستار و مسند ریاست کے متعلق تھا۔ چونکہ دستار و مسند ریاست میر رستم خاں کے حصے میں آئی بنابریں چوتھا حصہ ان کو دیا گیا۔

میر علی مراد خاں کے خلاف سازش کرنے والوں کی ناکامی و محرومی

سرکار انگلشیہ کے اس اعلان کے بعد کمیشن کی سفارشات کو عملی جامہ پہنانے کے انتظامات کر دیے گئے اور ریاست خیر پور کی قطع و برید شروع ہوگئی۔ یہ ریاست خیر پور کے لیے ایک ایسا

نقصان عظیم تھا جس نے اس کی حیثیت اور مرتبہ پر گہرا اثر ڈالا تھا۔ اس ہنگامہ کے بانیوں کو اپنی کوشش کا کوئی انعام نہ ملا جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے۔ میر صاحب کے خلاف سب سے پہلے شیخ علی حسین نے مخبری کی تھی اور اس کے ایما پر چارلس نیپیئر کے منشی مرزا علی اکبر نے میر صاحب کے خلاف سرکار میں رپورٹ کی تھی اس واقعہ کے بعد سرکار برطانیہ نے شیخ علی حسین کی دو سو روپے ماہانہ کی پنشن مقرر کر دی، لیکن وہ زیادہ عرصہ زندہ نہ رہا۔ آخر وقت اس نے مرزا علی اکبر کو اپنے پاس بلا لیا اور حسب ذیل وصیت لکھوائی۔

''میں مفلوک الحالی میں مر رہا ہوں اس لیے میری تجہیز و تکفین کے مصارف کے لیے سرکار برطانیہ سے درخواست کی جائے۔ سرکار نے دو سو روپے میری جو پنشن مقرر کی ہے وہ میرے اہل و عیال کو منتقل کر دی جائے، اسی عالم میں واقعہ تحریف کے متعلق اس نے اعتراف کیا کہ:

''افسوس ہے کہ میں نے میر علی مراد خاں کے ساتھ نمک حرامی کی اور انھیں نقصان پہنچایا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ مجھے میر صاحب سے دشمنی ہو گئی تھی۔ میں نے جو کچھ کیا خدا مجھے معاف کرے''۔

تحریف عہد نامہ کے متعلق ہماری رائے اور تحقیق

مرزا قلیچ بیگ مصنف تاریخ خیر پور کا میرانِ خیر پور سے بلا سبب تعصب

زیر بحث مقدمہ کے متعلق جتنا ریکارڈ ہمیں دستیاب ہو سکا ہے اس میں ایک قلمی قرآن پاک خاص اہمیت رکھتا ہے جس پر میر رستم خاں کا لکھا ہوا عہد نامہ بجنسہٖ ہمارے پاس موجود ہے جو ہمیں صاحبزادہ میر حاجی غلام حسین خاں ٹالپر (کوٹ ڈیجی) کے کتب خانہ سے دستیاب ہوا ہے اور جس کی تاریخی اہمیت کے پیش نظر ہم یہ طے کر چکے ہیں کہ اس کام سے فارغ ہوتے ہی اس قرآن پاک کو خیر پور کی سرکاری لائبریری میں محفوظ کرا دیں گے اور قرآن پاک سے ان تمام شہادتوں کی تردید ہوتی ہے جو جعلسازی کے اثبات میں لائی جاتی ہیں۔ یہ قرآن 26x20/8 سائز پر نہایت خوشخط لکھا ہوا ہے۔ حاشیے پر اسی کاتب کے قلم سے فارسی ترجمہ درج ہے۔ ہر صفحہ پر متن کی تیرہ سطریں ہیں۔ بین السطور سونے کے پانی سے چار چار باریک لکیریں کھنچی ہوئی ہیں۔ حاشیہ پر رنگین (برنگ سرخ و سبز و نیلگوں و نارنجی) پھولوں کی بیل ہے اس کلام پاک کی جلد جزو

نے اپنی نمک حرامی کا بڑی حسرت اور افسوس کے ساتھ اعتراف کیا۔

ہمارے اس خیال کو اس واقعہ سے بھی تقویت پہنچتی ہے کہ جب شیخ علی حسین کو میر علی مراد نے خیانت کے جرم میں برطرف کر دیا تھا تو پھر کس مقصد کے حصول کے لیے میر صاحب پر ناجائز دباؤ ڈال کر شیخ صاحب کو دوبارہ بحال کرایا گیا ظاہر ہے کہ اس مہرے کو جو میر صاحب کے ہاتھوں سے پٹ چکا تھا۔ پھر ان کی بساط مملکت پر زبردستی پہنچا دینے کے کچھ ٹھوس اغراض و مقاصد ہوں گے۔ جو الزام جعلسازی کے اثبات کی صورت میں رونما ہوئے۔

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ مرزا قلیچ بیگ نے اپنی تاریخ خیر پور میں اس جعلسازی کا ذکر کرتے ہوئے اپنی رائے ان الفاظ میں ظاہر کی ہے کہ:

> ''(سندھی کا اردو ترجمہ) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس واقعے کو چھپانے کے لیے میر صاحب نے اسے جو انعام دیا تھا وہ کافی نہ تھا۔ اس نے مزید انعام طلب کیا میر صاحب نے انکار کر دیا۔ اس لیے شیخ نے ان کی دشمنی پر کمر باندھی''۔

اس کے علاوہ بھی مرزا صاحب مذکور نے اپنے زورِ قلم سے اس الزام کی طرح طرح سے درست ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اور اسے اس حد تک ابھار دیا ہے کہ یہ الزام جو ایک فرضی افسانہ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ ان کی کتاب کے مطالعہ کے بعد ایک حقیقت واقعہ معلوم ہونے لگتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مرزا صاحب میران حیدر آباد سے بہت زیادہ متاثر نظر آتے ہیں اور ان کے بالمقابل میران خیر پور کو انھوں نے ہر موقع پر پست کرنے کی کوشش کی ہے جو مؤرخانہ دیانت داری کے منافی ہے۔ چنانچہ انھوں نے اپنی تاریخ میں میران حیدر آباد کے ضمنی تذکرے کو اس قدر نمایاں اور طویل صورت میں تحریر کیا ہے کہ اصل موضوع (تذکرہ خیر پور) ایک ثانوی امر بن کر رہ گیا ہے۔ اس معاملہ میں مرحوم نے میران حیدر آباد کا حق وطنیت ادا کرنے کے لیے یہاں تک تعصب سے کام لیا ہے کہ جنگ ہلانی میں سندھ کو فتح کرنے کا سہرا میر حیدر آباد میر فتح علی خاں کے سر باندھ دیا ہے۔ حالانکہ اس معرکہ کے اصلی سر کرنے والے میر سہراب خاں (خیر پور) تھے، جنھوں نے قلب لشکر میں در آ کر سالار فوج محمد حسن کھاوڑ کو قتل کیا تھا اور جن کا فاتح سندھ ہونا ''میر وڈے جوانگاس'' (بڑے میر کا علم) کے خیر پور میں نصب کیے جانے کی زندہ حقیقت سے ثابت ہے۔ جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

از خضا ہم بود ہیچ دم راہ مطلب غرض این است کہ آہو صفتاں رم نکنند

سچل فقیر سے عقیدت

مرحوم کو فقرا اور درویشوں سے کافی عقیدت تھی جب بھی وہ کسی تارک الدنیا درویش کا ذکر سنتے اس سے ملاقات کی کوشش کرتے اور اپنے لیے دعائے خیر کے طالب ہوتے۔ میر صاحب تمام فقرا میں سچل سرمست سے بہت مانوس تھے۔ سچل سرمست کا فارسی دیوان آپ ہی نے اپنے اہتمام سے طبع کرایا تھا۔

میر علی مراد خاں کی آزادی پسندی اور عام پالیسی

جہاں تک انتظام حکومت اور نظم و نسق کا تعلق ہے تو اس میں شبہ نہیں کہ اس معاملہ میں میر علی مراد خاں اعلیٰ درجہ کی صفات کے مالک تھے، وہ قدرتاً آزادی اور مطلق العنانی کو پسند کرتے تھے۔ نہیں گوارہ نہ تھا کہ کوئی ان کے معاملات میں دخیل ہو۔ چنانچہ انھوں نے ہمیشہ اس بات کی مزاحمت کی کہ حیدرآباد سندھ کے میر صاحبان ان کے نظام میں دخل دیں۔ میر صاحب کی پالیسی یہ تھی کہ وہ اپنی ریاستی فوج میں مقامی آدمیوں کو بہت کم بھرتی کرتے تھے۔ ان کا لشکر زیادہ تر ہندوستانیوں، پنجابیوں، پٹھانوں اور بہاول پوریوں پر مشتمل تھا۔ درحقیقت اس کی وجوہ سیاسی تھیں۔ کیونکہ مقامی آدمیوں کا سبھی میروں سے یکساں و دیرینہ تعلق تھا۔ اور وہ ہر وقت اپنی وفاداریوں کو تبدیل کر کے دوسری طرف جاسکتے تھے۔ لیکن دوسرے علاقوں کے رہنے والے سوائے اپنے نواب کے دوسرے سے کوئی رابطہ نہیں رکھتے تھے، حالات پر گہری نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ شروع میں میر صاحب کا ارادہ یہ تھا کہ میران حیدرآباد سے علیحدہ رہ کر اپنی الگ الگ مستقل بالذات حکومت قائم رکھیں۔ لیکن ابھی وہ اس ارادے کی تکمیل کے سازوسامان فراہم کر ہی رہے تھے کہ ایک تیسری قوت یعنی برطانوی طاقت میدان میں آدھمکی، اور میر علی مراد خاں نے بہت جلد محسوس کر لیا کہ ان کا مفاد انگریزوں سے بگاڑ میں نہیں ہے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے ہم عصر (خاندانی) حریفوں کو زک دینے کے لیے اس تیسری طاقت سے اتحاد کر لیا اور کون اعتراض کر سکتا ہے کہ ان کا یہ فیصلہ غلط اور ناعاقبت اندیشانہ تھا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو خیرپور کا بھی وہی حشر ہوتا جو میرپور اور حیدرآباد سندھ کی ٹالپور ریاستوں کا ہوا۔

میں کسی قسم کی دست اندازی نہ کی جائے گی"۔

ایک بار آپ نے سرکاری افسروں کو لکھ بھیجا کہ ہمیں اپنی شکارگاہیں اتنی عزیز ہیں جس قدر ہمارے اہل وعیال۔

اس سلسلہ میں یہ کہہ دینا ضروری ہے کہ یہ شوق صرف میر علی مراد خاں تک محدود نہ تھا بلکہ بھی میران ٹالپور اس شوق میں مبتلا تھے۔ میر فتح علی خاں تو اپنے اس شوق پر تقریباً چار پانچ لاکھ روپیہ سالانہ صرف کرتے تھے۔ ان دنوں میر صاحب کے متعلق ایک مثل مشہور تھی جس سے ان کے رجحان طبع اور طرز معاشرت کا پورا پتہ چل سکتا ہے۔ ضرب المثل یہ ہے "میر نصیر خاں رنگ (یعنی عیش وعشرت میں) میر سہراب خاں جنگ میں (یعنی ملک گیری اور جہاں کشائی میں) میر رستم خاں، میر رستم خاں بھنگ میں میر رستم خاں کو بطور خاص اس سے شوق تھا"۔ میر علی مراد خاں جھنگ میں (یعنی جنگل میں) سیر وشکار کی غرض سے۔

میر علی مراد کے معتمدین خاص

میر صاحب اپنے خاص عملہ میں سے سنگھ خزانچی، کشن داس، دشن داس اور حکیم امام الدین پر زیادہ اعتماد کرتے تھے۔ ہوت سنگھ کو میر صاحب کی سرکار میں اس قدر، رسوخ حاصل تھا کہ خود میر صاحبان ٹالپور اور دوسرے اس پر حسد کرنے لگے تھے۔ ہوت سنگھ کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ لین دین میں بہت ہوشیار تھا اور جب بھی میر صاحب کو رقم کی ضرورت ہوتی وہ کہیں نہ کہیں سے فراہم کر دیتا۔ منشی کشن داس اور دشن داس بھی ان کے معتمد خاص تھے۔ ولایت جانے سے قبل وہ اپنے منشی حکیم امام الدین پر بڑا بھروسہ کرتے تھے اور حکیم امام الدین ان کے ہمراہ ولایت بھی گئے تھے، لیکن بعد کو میر علی مراد خاں نے ہوت سنگھ وغیرہ کی سازش سے امام الدین کو نکال دیا اور اسے قید میں ڈال دیا، جہاں تک سید جعفر علی شاہ کا تعلق ہے تو وہ میر صاحبان کے دربار میں کافی معزز اور باوقار تھے۔

مذہب

میر علی مراد خاں بھی اپنے دوسرے اہل خاندان کی طرح عقیدتاً شیعہ تھے، لیکن ان کا شعار بے تعصبی کا تھا۔ ان کے تمام ملازمین اور اہل کار غیر شیعہ تھے۔ میر صاحب محرم میں عزاداری

صاحب تمام کام بہ اختیار خود انجام دیتے تھے۔

خان بہادر قادر داد خان نے ریاست کی انتظامی مشنری کی ضروری اصلاح کے بعد سب سے پہلے اپنی توجہ ریاستی عوام کی اخلاقی، معاشرتی، تعلیمی اور اقتصادی حالت بہتر بنانے پر مبذول کی۔ اس سعی و کوشش کا نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ عرصہ میں ریاست کے اندر چند اسکول کھل گئے۔ خان بہادر قادر داد خان نے یہ دیکھ کر کہ ریاست میں آبادکاری کی کافی گنجائش ہے اور زرخیز اراضیات گھنے جنگل سے ڈھکی ہوئی ہیں بہت سے جنگلات کٹوا دیے اور ان جنگلات کو زرعی اراضیات میں تبدیل کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ نظام مال گزاری کی از سر نو اصلاح کی گئی، لگان کی وصولی کا معقول انتظام کیا گیا، آب پاشی کے لیے فیض بخش واہ، فیض گنج واہ، فیض بحر واہ اور فیض موج واہ کھدوائی گئیں۔ ان نہروں کا طول تقریباً تین سو میل تھا اور ان سے 314 میل رقبہ سیراب ہوتا تھا۔ ضرورت مند کسانوں میں ہل، مویشی اور آلات کشاورزی تقسیم کیے گئے۔ جابجا کچی پکی تقریباً تین سو میل سڑکیں تیار کرائی گئیں۔ اس کے بعد وہ سڑک تیار کرائی گئی جو حیدر آباد سے روہڑی جاتی ہے اور خیر پور سے گزرتی ہے۔ اسی زمانے میں ڈاک کا بھی نیا انتظام کیا گیا۔ اگرچہ شروع میں ریاستی ٹکٹ بھی جاری رہے مگر انجام کار پوسٹ آفس کے ٹکٹ استعمال ہونے لگے۔ اسی عہد میں ریاست کے اندر تار گھر بھی قائم ہوا اور ریاست کا پوسٹ اینڈ ٹیلی گراف آفس سندھ بلوچستان کے سرکل سے ملحق کر دیا گیا۔

ان اصلاحات کا نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے ہی عرصہ میں ریاست کی آمدنی بڑھ گئی۔ تعلیمی، زرعی اور اقتصادی اصلاحات کے ساتھ ریاست میں متعدد خوش نما عمارتیں بنوائی گئیں۔ ایک لائبریری، ایک اسپتال اور چار ڈسپنسریاں جاری کی گئیں۔ اسکولوں کے ساتھ اقامت گاہیں بنائی گئیں جہاں طلبہ کی رہائش و خور و نوش کا انتظام تھا۔ اس سے قبل سندھ مدرسۃ الاسلام کراچی کو ریاست کی طرف سے سالانہ چھ ہزار روپیہ امداد دی جاتی تھی۔ اس امداد میں چار ہزار کا اضافہ کر دیا گیا اور طلبہ کے وظائف میں بھی توسیع کی گئی۔

1900ء میں غالیچہ بافی کا ایک کارخانہ کھولا گیا، اور امرتسر سے کاریگر بلوا کر اس کارخانہ میں ملازم رکھے گئے۔ اس خارخانے کا بنا ہوا ایک قالین ولایت کی نمائش میں بھیجا گیا تھا جس کے چار کونوں پر ایک ایک طاؤس اور وسط میں ایک طاؤس رقصاں کی تصویریں تھیں۔ یہ قالین وہاں

بہت پسند کیا گیا۔

میر علی مراد خان مرحوم کے زمانہ میں ریاست کی فوج بے قاعدہ سپاہیوں کی ایک جماعت تھی جس پر مؤثر کنٹرول کا فقدان تھا۔ نئے نظام حکومت کے تحت انفنٹری کی ایک تربیت یافتہ پلٹن تیار کی گئی۔

1903ء میں خان بہادر خان داد خان کے بجائے سردار محمد یعقوب خان وزیر ریاست مقرر ہوئے۔ سردار محمد یعقوب خان بھی اپنے پیش رو خان بہادر کی طرح انگریز حکام کے معتمد اور خطاب یافتہ تھے۔ حکومت برطانیہ نے وفادارانہ خدمات کے سلسلے میں انھیں 1897ء میں سردار کا اور 1900ء میں سی۔ آئی۔ اے کا خطاب دیا تھا۔ سردار محمد یعقوب خان نے قلمدان وزارت سنبھالتے ہی اصلاحات کی اس مہم کو اور تیز کیا جس کی داغ بیل ان کے پیش رو نے ڈالی تھی۔ ان کے زمانے میں خیر پور میں انگریزی اسکول قائم ہوا اور ایک بورڈنگ ہاؤس بنا۔ نیز فیض محل اور دوسری عمدہ عمدہ عمارتیں بن کر تیار ہوئیں۔

1907ء مین اچانک سردار محمد یعقوب خان کا انتقال ہوگیا اور مئی 1907ء میں ان کی بجائے شیخ صادق علی خاں وزیر ہوئے۔ ان کے عہد وزارت میں ریاست کی ترقی بدستور جاری رہی۔ 1908ء میں لارڈ کچنر جو مہدی سوڈانی جنگ کے سبب ایک تاریخی شخصیت قرار پاگئے ہیں ہندوستان کے کمانڈر انچیف کی حیثیت سے خیر پور تشریف لائے جہاں ان کا شاندار استقبال کیا گیا۔

برطانیہ سے میر فیض محمد خان کے تعلقات

1894ء میں مسٹر ایون جیمس کے بجائے سر چارلس ایکونٹ سندھ کے کمشنر مقرر ہوئے۔ ان کے زمانے میں وائسرائے ہند لارڈ امہرسٹ سندھ کے دورہ پر تشریف لائے۔ میر فیض محمد خان نے سکھر میں ان سے ملاقات کر کے مشترکہ مفادات پر دوستانہ گفتگو کی۔

1899ء میں جب گورنر بمبئی جیکب آباد آئے تو میر صاحب دربار گورنری میں تشریف لے گئے۔ گورنر بمبئی نے میر صاحب کی بڑی خاطر مدارات کی اور انھیں شہنشاہ برطانیہ کی طرف سے جی۔ سی۔ آئی۔ اے کا تمغہ اور نائٹ کا خطاب دیا۔ اس طرح میر صاحب بھی اپنے پدر بزرگوار کی طرح سر ہو گئے۔

کچھ دیر گفتگو کے بعد رخصت ہوئے۔ میر صاحب نے ایک رومال میں کچھ نذرانہ پیش کرنا چاہا مگر مولوی صاحب نے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ یہ تو میرا دینی فریضہ تھا کہ جو مہمان اتنی دور سے ہمارے شہر میں آیا ہے اور وہ قوم وملت کا ہمدرد ہے۔ اس سے ملاقات کی جائے۔ البتہ تحفہ پیش کرنے کی ہم لوگ استطاعت نہیں رکھتے، اس لیے قطعہ کے چند کلمات پر اکتفا کیا گیا۔

میر صاحب دوسرے یا تیسرے روز مولوی صاحب کی بازدید کے لیے تشریف لے گئے اور کھجور والی مسجد میں پہنچ کر اسی چٹائی پر نشست کی جس پر بیٹھ کر مولانا عبادت کیا کرتے تھے۔ چلتے وقت مولوی صاحب سے خیر پور آنے کا وعدہ لیا اور واپسی میں پنجہ شریف میں مزار شہید رابع علیہ الرحمہ کی زیارت کی اور اس درگاہ کے لیے ایک ہزار روپیہ مولوی صاحب کی معرفت پیش کیا۔

میر فیض محمد خاں کے اخلاق وعادات

میر فیض محمد خاں بڑے نرم طبیعت سادگی پسند، رحم دل اور منکسر المزاج حکمران تھے۔ عجز و انکسار آپ میں اس حد تک پایا جاتا تھا کہ اپنے ادنیٰ درجہ کے ملازمین سے بھی بڑے خلق مدارات کے ساتھ پیش آتے تھے۔ مگر کسی ملازم کی یہ مجال نہ تھی کہ آداب شاہی کے خلاف کوئی کلمہ زبان سے نکالے۔ یا ناملائم بے تکلفی کا اظہار کرے۔ ایک برطانوی افسر نے آپ کے اخلاق پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''اگرچہ آپ کے بھائی میر شاہنواز میں آپ سے زیادہ ہمت تھی
> مگر مروت اور نرم دلی میں میر فیض محمد اپنا جواب نہیں رکھتے تھے''۔

میر علی مراد خاں ان کے فہم وفراست پر بڑا اعتماد رکھتے تھے اور اسی لیے انھیں اپنے ہمراہ ولایت لے گئے تھے لیکن میر فیض محمد وہاں جا کر علیل ہو گئے اور واپس چلے آئے۔

میر فیض محمد ایک انصاف پسند، رعایا پرور، بنی نوع انسان کے ہمدرد، غریبوں اور محتاجوں کے سرپرست اور شفقت سے پیش آنے والے حاکم تھے۔ اخلاق شخصی کے مجرم کو اگر وہ اپنی غلطی پر شرمساری کا اظہار کرتا تھا تو معاف کر دیتے تھے لیکن اخلاق اجتماعی کے مجرموں سے درگزر نہ کرتے تھے۔ دسترخوان وسیع تھا، جس پر کئی قسم کے کھانے ہوتے تھے۔ مگر وہ سادہ غذا تناول کرنے کے عادی تھے۔ شاہی مطبخ سے بہت سے غریبوں اور مسکینوں کو روزانہ کھانا تقسیم ہوتا تھا۔ زکوٰۃ بھی تقسیم

اور سزا یافتہ قیدی کام کرتے تھے۔ اس کارخانہ میں ولایت کے نمونے پر کام ہوتا تھا اور دور دور کے آرڈرز کی تعمیل کی جاتی تھی۔ پارچہ بافی کے کارخانے بھی چھوٹے پیمانے پر جاری کیے گئے۔ عمدہ عمدہ قسم کے بیج منگوا کر کاشتکاروں کو تقسیم کیے گئے۔ نمونے کا زراعتی فارم کھولا گیا۔ بٹائی کا معقول بندوبست کیا گیا۔ جس سے تغلب کا امکان ختم ہوگیا۔ میرواہ میں ریگولیٹر لگوایا گیا جس سے آبپاشی میں نمایاں آسانیاں پیدا ہوگئیں، ریاستی فوج از سرنو منظم کی گئی، کیڈٹ کور کا بندوبست کیا گیا، زنانہ اسپتال کے لیے وسیع شاندار عمارت بنوائی گئی، پاور ہاؤس قائم کیا گیا اور برقی روشنی سے سرکاری افسران کے علاوہ عوام کو بھی مستفیض ہونے کا موقع دیا گیا اور انجمن حمایت الاسلام لاہور کو ایک معقول عطیہ دیا گیا۔

عدلیہ کا نظام اس دور میں بہت کچھ برطانوی نظام حکومت کے سانچے میں ڈھالا گیا اور اس شعبے میں کافی اصلاحات ہوئیں، مگر ہائی کورٹ کی حیثیت میر صاحب ہی کے دربار کو حاصل رہی، جس کا مرافعہ کسی اور عدالت میں نہیں کیا جا سکتا تھا۔

خیرپور میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس

1919ء میں آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا معرکۃ الآرا اجلاس خیرپور میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں دور دور کے مندوبین نے شرکت کی۔ جن کی پذیرائی کے فرائض ریاست نے اپنی روایتی اولوالعزمی کے ساتھ انجام دیے، اس موقع پر ایجوکیشنل کانفرنس کے لیے ایک شاندار پنڈال بنایا گیا تھا۔ میاں محمد ابراہیم وزیر ریاست نے بذات خود کانفرنس کے انعقاد و اہتمام میں سرگرم حصہ لیا۔ حقیقت یہ ہے کہ خیرپور میں آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ اجلاس مسلمانان سندھ کی تعلیمی تاریخ میں انقلاب انگیز حیثیت رکھتا ہے۔

میر علی نواز خان ولی عہد کا ترک سکونت اور پھر واپسی خیرپور

1920ء میں بعض گھریلو معاملات کے متعلق میر علی نواز خان ولی عہد اور میاں محمد ابراہیم وزیر کے درمیان سخت اختلاف رائے پیدا ہوگیا اور میر علی نواز ناراض ہو کر خیرپور سے دہلی چلے گئے، جس کے بعد برطانوی حکومت کے ایما سے میاں محمد ابراہیم کے بجائے میر امام بخش نے شیخ محمد قادر کو بمبئی سے طلب کر کے اپنا وزیر مقرر کیا۔ وزارت بدل جانے کے بعد میر علی نواز خان خوش

نظم و نسق میں ردوبدل اور اصلاحات

میر علی نواز خان کے وزیر شیخ محمد قادر اور نائب وزیر شیخ شیر علی تھے جو ریاست خیر پور کی نائب وزارت سے قبل سانگھڑ میں تحصیلدار تھے۔ ہز ہائی نس نے برسر اقتدار آتے ہی تولارام کو اراضیات کے حقوق کی جانچ پڑتال کے لیے افسر تحقیقات مقرر کیا۔ عبدالمجید دریشانی ایم۔ اے کو خیر پور ہائی اسکول کا پرنسپل بنایا گیا اور اسی وقت اس اسکول کا نام ناز ہائی اسکول رکھا گیا۔ دریشانی اس سے قبل بھی اس عہدے پر سرفراز رہ چکے تھے۔ مٹھارام کو سپرنٹنڈنٹ محکمہ مردم شماری مقرر کیا۔ یہ پہلے بھی ریاستی ملازمت میں تھے۔ اسی طرح گیان چند کو امدادی انجمنوں کی نگرانی تفویض کی۔ غرض عہدہ داروں میں کافی ردوبدل کیا گیا اور کارگزار آدمی اہم فرائض کی بجا آوری کے لیے مقرر کیے گئے اس طرح ریاست کے انتظامی جسم میں نئی روح دوڑ گئی۔ اور عام طور پر یہ محسوس کیا جانے لگا کہ خیر پور کے نئے حکمران کے روپ میں ریاست کو ایک قابل اعتبار رہنما مل گیا ہے۔ جو تعلیم جدید کی خوبیوں سے مالامال اور مشرقی تربیت کے اوصاف سے متصف ہے۔

میر علی نواز کے عہد حکومت میں کافی اصلاحات عمل پزیر ہوئیں۔ ایک لاکھ کے صرفے سے ایک نہر نکالی گئی جس سے اور بہت سی چھوٹی چھوٹی نہریں نکلیں (21) جن کی مجموعی لمبائی 25 میل تھی۔ مزید آٹھ ہزار ایکڑ زمین زیر کاشت لائی گئی۔ آپ سے پہلے سال بھر میں تین ماہ نہروں سے آبپاشی ہوا کرتی تھی مگر آپ نے کاشتکاروں کی اصلاح حال کے لیے پورے سال نہریں جاری رہنے کے انتظامات فرمائے۔ شہر میں آب نوشیدنی کی قلت کے پیش نظر واٹر ورکس قائم ہوا اور نل لگائے گئے۔ بہت سے مدارس ریاست کے طویل و عرض میں کھولے گئے۔ مستقر کا اسکول ہائی اسکول بنایا گیا مقروض کا کاشتکاروں کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے متعدد قانون وضع ہوئے۔

میر علی نواز کے عہد کا نظام حکومت

یوں تو میر علی نواز سے پہلے برطانوی قوانین کا ریاست میں نفاذ ہو چکا تھا مگر حقیقت یہ ہے کہ خیر پور کی عدلیہ میر علی نواز ہی کے عہد حکومت میں باضابطہ طور پر منظم ہوئی۔ میر امام بخش کے عہد تک میر صاحبان ہائی کورٹ کے سربراہ اور وزیر جموں کے فرائض انجام دیا کرتے تھے۔ مگر میر

(21) بڑی نہر کے علاوہ چھوٹی نہروں کی لمبائی 25 میل تھی۔

زبانوں کے شاعر تھے۔ ناز تخلص فرماتے تھے۔ اردو میں آپ کا ایک دیوان ''گلدستہ ناز'' کے نام سے مطبع منشی نول کشور لکھنؤ میں طبع ہوا تھا۔ جسے دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ کسی سندھی نژاد کا کلام ہے۔ غزل کے علاوہ سلام اور رباعیات بھی کہتے تھے۔ آپ نے سندھی زبان میں رباعیات عمر خیام کا ترجمہ نظم فرمایا ہے۔ جو آپ کی یادگار تصنیف ہے۔ افسوس ہے کہ آپ کی شاعرانہ عظمتیں جہانبانی کی صلاحیتوں کے پردے میں مخفی ہو کر رہ گئی ہیں۔ ورنہ آج داغ اور امیر کے بعد آپ کا نام نامی بھی متاخرین اردو کی صف میں جگہ پاتا۔ شاید کوئی ہل دل اٹھے اور آپ کے کلام پر خامہ فرمائی کر کے اس ہیرے کی آب وتاب سے اردو ادب کی محفل کو منور کر دے جو گمنامی کے گرد و غبار سے اٹ کر رہ گیا ہے۔

میر صاحب کی اردو شاعری کا اصلی عنصر غزل یعنی شعر کی سب سے زیادہ مشکل اور پامال صنف ہے اور در حقیقت غزل ہی سے کسی شاعر کے تخیل کی حقیقی پرواز اور اس کی قدرت کلام کا اندازہ ہو سکتا ہے زیر نظر سطور میں ناز مرحوم کی غزلیات ہی پر روشنی ڈالی گئی ہے اور یہ واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ ناز مرحوم کی غزلیات کو تاریخ، شعر وادب میں کیا مقام حاصل ہے اور یہ کہ آیا انھوں نے سرمایہ غزل میں کوئی خاص اضافہ کیا ہے یا مرحوم کا یہ شوق صرف وہی درجہ رکھتا ہے جو اکثر والیان ریاست بعض فنون لطیفہ کی نسبت ظاہر کیا کرتے ہیں۔

ناز مرحوم کا انتقال 1935ء میں ہوا تھا اور اس طرح وہ ماضی کے شاعر نہیں بلکہ ان کا شمار اردو کے شعرائے عصر جدید میں کیا جانا چاہیے۔ لیکن یہ کس قدر افسوسناک حقیقت ہے کہ اس قدر قریب العہد ہونے کے باوجود ناز مرحوم کی شاعرانہ عظمت کا اندازہ ان کے بہت کم معاصرین کو ہے۔ غالباً اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ وہ اس زمانہ کے سندھ کی سب سے بڑی ریاست خیر پور کے حکمران بھی تھے اور ان کی شاعرانہ شخصیت ان کی حاکمانہ شخصیت میں دب کر رہ گئی تھی۔ والیان ریاست اور صاحبان حکومت کے ساتھ ادبی تاریخ میں ہمیشہ ناانصافی کی گئی ہے، یا تو ان کے کمال فن کو ان کے درباری شاعروں کی محنت اور خوشامد کا نتیجہ قرار دے دیا گیا ہے، جس طرح شاہ عالم بہادر ظفر، واجد علی شاہ اور نواب کلب علی خان مرحوم (آف رام پور) کے معاملے میں ہوا، یا ان کے کارہائے حکومت نے لوگوں کی توجہ اس قدر اپنی طرف جذب کر لی کہ ان کی شاعرانہ اور ادبی اہمیت دھندلی پڑ گئی۔ جس طرح بابر، ہمایوں، عالمگیر اور بیرم خان وغیرہ، کہ

تاریخ کو یہ تو یاد رہا کہ وہ اپنے عہد کے نامور کشور کشاؤں اور سیاسی مدبروں میں تھے مگر یہ بات یاد نہ رہی کہ انھیں قدرت نے شعروادب کی بے نظیر صلاحیتیں عطا کی تھیں۔ وقت آ گیا ہے کہ ناز مرحوم کی شاعرانہ عظمت کا اسی طرح اعتراف کیا جائے جس طرح دوسرے اساتذہ فن کی عظمت و اہمیت کو تسلیم کیا گیا ہے۔

میر علی نواز ناز مرحوم کے رنگ تغزل اور آہنگ تخیل کو معین کرنے اور اردو غزل کی دنیا میں ان کے صحیح مقام کی تشخیص سے قبل یہ ضروری ہے کہ اردو غزل کے ان دو مکاتب فکر پر قدرے گفتگو کر لی جائے جو ناز کی شاعری کے ابتدائی دور میں کھل چکے تھے اور پھر یہ دیکھا جائے کہ ناز مرحوم کس مکتب فکر سے تعلق رکھتے ہیں۔

اردو غزل کے ایک مکتب فکر و خیال کی خصوصیات ہیں۔ حسن بیان کے ساتھ عشق و محبت کے خارجی پہلو کی تصویر کشی، محبوب کے خدوخال، ناز ادا، کرشمہ و جمال اور غمزہ ادا کا بیان اور پھر معاملات محبت کی ان داستانوں کی ترجمانی جو وجدان روح کے بجائے نفس و جسم سے تعلق رکھتی ہیں۔ یا پھر مبالغہ آرائی کے ساتھ ہجر ناتوانی، انکسار، نیاز مندی اور موت کے مضامین بیان کرنا، یا پھر اخلاقیات کی من حیث الاخلاق تعلیم و تلقین اور قیاس منطقی کے ڈھنگ پر شاعرانہ استدلال یا پھر الفاظ و محاورات کی صحت استعمال کی کوشش کی اور اس کوشش کی سلسلے میں ضرورت سے مبالغہ۔ یہ رنگ ارباب تغزل کے ایک خاص طبقے سے تعلق رکھتا ہے۔ انشا، خواجہ وزیر اور ناسخ وغیرہ اس طبقے کے سرگردہ ہیں اور حق یہ ہے کہ زبان اور اسالیب بیان کے تحفظ کے سلسلے میں ان کی یہ کوششیں حد درجہ ممیز ہیں۔

غزل کے دوسرے مکتب کے خصوصیات ہیں محبت کی داخلی کیفیات اور واردات کی ترجمانی اور حقیقی عشق کی خوش گوار چاشنی کے ساتھ واردات روح کا بیان۔ یہ طرز عموماً دہلی کے چند شعرا کے ساتھ مخصوص رہا ہے اور اساتذہ لکھنؤ کے بعض افراد نے بھی اسی راہ کو اختیار کیا ہے۔ اس طرز کے سب سے وقیع نمائندے میر، غالب اور مومن وغیرہ ہیں۔

اردو غزل کے دونوں مکاتب فکر کی یہ تقسیم تخیلی اور معنوی اعتبار سے کی گئی ہے۔ جہاں تک اسالیب بیان اور زبان کا تعلق ہے اس سلسلے میں بھی دونوں مکتبوں کے خصوصیات الگ الگ ہیں۔ مثلاً لکھنؤ کے غزل نے غزل میں بڑی رنگین زبان استعمال کی ہے۔ دلی میں تغزل کی زبان فارسی

آمیز اور بعض جگہ پر شکوہ بھی ہے مگر انفعال اور تاثر کی کیفیت یہاں کی غزل میں قریب قریب سب کے یہاں پائی جاتی ہے۔

اردو غزل گوئی کے مذکورہ بالا مکاتب فکر اور ان کی معنوی و بیانی (انشائی) خصوصیات کو پیش نظر رکھ کر غزلیات ناز کی حقیقی قدر و قیمت اور معنویت کو پرکھا جائے تو ان کے یہاں دہلی کا عکس زیادہ اور لکھنؤ کی تاثیر خال خال نظر آتی ہے ان کی ''گلدستہ'' کی پہلی غزل دستور کے مطابق حمد میں ہے اس کا مطلع ہے۔

ناقص سے کیا بیاں ہو یا رب کمال تیرا
خورشید و ماہ میں ہے جاہ و جلال تیرا

اس مطلع میں نہ کوئی فلسفہ ہے نہ جذباتی نکتہ صرف ایک عقیدہ ہے لیکن کس قدر سادگی اور کتنی استواری کے ساتھ نظم ہو گیا ہے۔ پہلے مصرع میں ''ناقص'' اور ''کمال'' کے جمع ہونے سے صرف صنعت تضاد ہی نہیں پیدا ہوئی بلکہ مضمون میں ایک عجیب قسم کا استدلال اور اس استدلال سے استحکام پیدا ہو گیا ہے۔ جس کی تشریح یہ ہے کہ پہلا مصرع یوں بھی کہا جا سکتا تھا۔

بندے سے کیا بیاں ہو یا رب کمال تیرا

مگر بندے کی جگہ ناقص کا لفظ چن کر شاعر نے اپنے دعوے کو مدلل بنا دیا ہے۔ کیوں کہ کمال کو وہی سمجھ سکتا اور بیان کر سکتا ہے جو خود کمال رکھتا ہو۔ لیکن جو ناقص ہے وہ کمال کی حدوں کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ پھر بیان کرے تو کیوں کر اب دیکھیے لفظ ''ناقص'' اس مصرعے میں نگینے کی طرح جڑا ہوا ہے۔ یا نہیں۔ اس کا نام ہے بندش کی پختگی کہ ایک لفظ ہٹا دیجیے تو مضمون میں خلا پیدا ہو جائے۔ دوسرے مصرعے میں سادگی کے ساتھ ساتھ لف و نشر غیر مرتب نے حسن کلام کو دوبالا کر دیا ہے اس غزل کا مقطع لفظی صنعت گری کے رنگ میں لکھا ہے۔ فرماتے ہیں۔

گیسو کی الجھنوں سے اس ناز کو نکالا
احسان مند رب ہے بال بال میرا

گیسو کی الجھن اور بال بال، ابہام تناسب مراعاۃ النظیر اور محاورے کے برمحل استعمال کی بہترین مثالیں ہیں۔ مگر یہ شعر پڑھ کر اور اس کی روانی کو دیکھ کر کون خیال کر سکتا ہے کہ یہ مصرع

عوام کی تحریک سے نظام میں ردوبدل

اسی زمانے میں عوام کی جانب سے وزیر ریاست خان بہادر اعجاز علی سے یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ اب ریاستی عوام کا سیاسی شعور بیدار ہو چلا ہے اور وہ اپنے برے بھلے کو سمجھنے لگے ہیں۔ اس لیے انھیں اصلاحات کی ایک قسط ملنا چاہیے۔ ایسوسی ایشن ایکٹ کی رو سے تقریر و تحریر پر جو پابندیاں عائد ہیں، انھیں اب زیادہ عرصے تک برداشت نہیں کیا جاسکتا۔ اوّل اول خان بہادر اعجاز علی خاں نے عوام کے اس مطالبے کی طرف کوئی اعتنا نہ کی مگر جب عوام کا اصرار بڑا تو وہ اپنی عادت کے مطابق تشدد پر آمادہ ہو گئے۔ خان بہادر کی طرف سے جتنی سختی بڑھتی گئی اتنا ہی عوام کے اشتعال میں اضافہ ہوتا گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ریاست میں باقاعدہ طور پر ایجی ٹیشن شروع ہوگیا اور سیاسی قیدیوں کے لیے جیل خانے کا دروازہ کھول دیا گیا۔ شہر میں مسلح پولیس گشت کرنے لگی۔ لیڈروں کے گھروں پر پہرے بٹھا دیے گئے، عوام جب حکومت کے اس رویہ سے زیادہ بے چین ہوئے تو خیر پور کے ذی اثر حضرات کا ایک وفد ریزیڈنٹ کے سامنے عوام کا نکتہ نگاہ پیش کرنے کے لیے خیر پور سے لاہور بھیجا گیا۔ یہ وفد مسٹر الٰہی بخش خمیسانی ایڈووکیٹ، مسٹر غلام رسول صدیقی ایڈووکیٹ، مسٹر علی محمد مری، حاجی ارباب غلام مرتضیٰ، حاجی عطا محمد لُنڈ، سرائی قلندر بخش خان، حاجی پنل خان، شیخ بہاء الدین ایڈووکیٹ اور صاحبزادہ میر خان محمد پر مشتمل تھا۔ اس وفد نے لاہور کے ایک ہوٹل میں ایک پریس کانفرنس منعقد کی جس کے بعد اخباروں نے خیر پور کے عوام کی تائید میں حکومت خیر پور سے احتجاج کیا اور اداریے لکھے۔ ریزیڈنٹ نے بھی عوام کے مطالبے سے ہمدردی کا اظہار کیا مگر عملاً کوئی فوری قدم نہ اٹھایا۔ کچھ روز بعد ایک وفد دہلی اور شملہ میں ریزیڈنٹ سے ملا جو صاحبزادہ میر غلام حسن خان، صاحبزادہ میر حاجی غلام حسین خان، صاحبزادہ میر علی ڈینا خان، صاحبزادہ میر خان محمد خان اور شیخ بہاء الدین ایڈووکیٹ پر مشتمل تھا۔ اس وفد نے ریزیڈنٹ کے علاوہ اپنے دو نمائندوں کو قائداعظم کی خدمت میں بھی بھیجا۔ انھوں نے بھی خیر پوری عوام کے مطالبے کی تائید کی۔ یہ وفد دہلی اور شملہ میں دو مہینے تک مقیم رہا۔ بالآخر ریزیڈنٹ نے خیر پور کے موجودہ نظام میں ردوبدل پر آمادگی ظاہر کی جس کا خاکہ وہیں طے کر لیا گیا۔

بورڈ آف ریجنسی کا قیام

مذکورہ بالا جدوجہد کے خاتمہ پر یہ طے ہوا کہ آئندہ ریاست میں، ہز ہائی نس میر علی مراد خان ثانی کے اختیارات سنبھالنے کا وقت آنے تک صاحبزادگان کا بورڈ آف ریجنسی ان کی نیابت کے فرائض انجام دے گا۔ یہ بورڈ انتظام ریاست کے لیے ایک ایگزیکٹیو کونسل بنائے گا۔ اس کونسل کا پریذیڈنٹ صاحبزادگان میں سے چنا جائے گا جسے بورڈ ہر سال منتخب کیا کرے گا۔ کونسل کے تین اور ارکان عوام جن میں ایک وائس پریذیڈنٹ کہلائے گا اور دو وزیر ہوا کریں گے اور ان میں سے ایک کو وزیر اور دوسرے کو ایڈوائزر کہا جائے گا۔ اس نظام پر فوراً عملدرآمد شروع کر دیا گیا۔ چناں چہ میر حاجی غلام حسین خان ٹالپور بورڈ آف ریجنسی کے چیئرمین منتخب ہوئے اور آپ ہی کو بورڈ نے ایگزیکٹیو کونسل کا پہلا پریذیڈنٹ منتخب کیا۔ خان بہادر اعجاز علی خان وائس پریذیڈنٹ کے عہدے پر مامور کیے گئے۔ شیخ بہاؤالدین اور خان بہادر قلابے والا وزارت کے لے نامزد ہوئے۔ خان بہادر اعجاز علی خان نے وائس پریذیڈنٹ بن کر رہنا پسند نہ کیا اور ریاست سے تعلق منقطع کر کے چلے گئے، جن کے بعد وائس پریسیڈنٹ کا عہدہ خالی رہا اور کچھ عرصہ بعد ختم ہو گیا۔

پریذیڈنٹ اور دونوں وزیروں میں پورٹ فولیو اس طرح تقسیم کیے گئے۔

پریذیڈنٹ: لا اینڈ آرڈر، فنانس، ریونیو، پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ۔

خان بہادر قلابے والا: پی۔ ڈبلیو۔ ڈی۔ اریگیشن۔

شیخ بہاؤالدین: دیگر جملہ محکمہ جات۔

یہ سلسلہ اعلیٰ حضرت میر علی مراد خان ٹالپور کو اختیارات حکومت تفویض ہونے تک جاری رہا۔ اس دوران میں حسب ذیل صاحبزادگان علی الترتیب کرسی صدارت پر رونق افروز ہوئے۔

1- صاحبزادہ میر حاجی غلام حسین خان ٹالپور	جون 47ء سے مئی 48ء تک
2- صاحبزادہ میر علی ڈینا خان ٹالپور	جون 48ء سے مئی 49ء تک
3- صاحبزادہ میر علی محمد خان ٹالپور	جون 49ء سے مئی 50ء تک
4- صاحبزادہ میر غلام حسین خان ٹالپور	جون 50ء سے مئی 51ء تک
5- صاحبزادہ میر خان محمد خان ٹالپور	جون 51ء سے ستمبر 51ء تک

حکمران کا صرف خاص، پولیس و فوج، رفاہ عامہ، صاحبزادگان کے مصارف آمدنی اور اس کی رفتار ترقی زیر نظر مختلف ادوار میں حسب ذیل رہی۔

میر علی مراد خان اوّل کے دور میں:

تقریباً نو لاکھ روپیہ سالانہ

میر فیض محمد خان اوّل کے دور میں:

1903ء سے میں تقریباً 13 لاکھ روپیہ سالانہ۔ 1909ء میں تقریباً 15 لاکھ روپیہ سالانہ

میر امام بخش کے دور میں:

1912ء میں تقریباً ساڑھے اٹھارہ لاکھ روپیہ سالانہ

میر علی نواز کے دور میں:

1935ء میں تقریباً 39 لاکھ روپیہ سالانہ

پریزیڈنسی کے دور میں:

1947ء میں تقریباً 54 لاکھ روپیہ سالانہ

موجودہ میر علی مراد خان کے دور میں تفویض اختیارات کے بعد:

1954ء میں ڈیڑھ کروڑ روپیہ سالانہ

ریاست خیر پور تقسیم ہند کے بعد

ریاستی کونسل کی مشکلات اور پاکستان سے ریاست کا الحاق:

جس وقت تقسیم ہند کا یادگار تاریخی واقعہ پیش آیا اور پاکستان بنا اس وقت ریاست خیر پور میں صاحبزادہ میر حاجی غلام حسین خان ٹالپور پریذیڈنٹ کے منصب پر فائز تھے اور آپ کو آئینی طور پر حکمران ریاست کے اختیارات حاصل تھے۔ ریونیو، فنانس، پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ اور لا اینڈ آرڈر کے رپورٹ فولیو بھی آپ ہی کے ہاتھ میں تھے۔ قلم دان وزارت شیخ بہاء الدین اور خان بہادر قلابے والا کے سپرد تھا، جو پریذیڈنٹ کے دائرہ عمل کے علاوہ دوسرے تمام محکموں کے

انچارج تھے۔(جس کی تفصیل پہلے بتائی جا چکی ہے) انھیں تین ارکان پر مشتمل ایک کونسل تھی جو حکومت کے نظم ونسق کی ذمہ دار تھی۔

ہز ہائی نیس سر علی مراد خان والی خیر پور تقسیم ہند کے موقع پر موسم گرما بسر کرنے کے لیے کشمیر میں فروکش تھے، جہاں اس وقت بڑے زور وشور سے فسادات شروع ہو چکے تھے۔ آپ کی والد بزرگوار میر فیض محمد خاں (جو دیوانہ قرار دیے جا چکے تھے) پونا میں مقیم تھے جو تقسیم کے بعد بھارتی علاقے کا جزو قرار پا چکا تھا۔ تقسیم کا اعلان ہوتے ہی ریاستی کونسل یکا یک چاروں طرف سے سخت مشکلات میں گھر گئی جن میں سب سے مقدم ہز ہائی نیس اور ان کے والد بزرگوار کو کشمیر اور پونا سے نکال کر خیر پور لانے کا مسئلہ تھا۔ جس کی ان کی بے پناہ ہنگاموں میں جو پاکستان بنتے ہی پورے ملک کے طول وعرض میں طوفان کی طرح امنڈ رہے تھے۔ ظاہراً کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ اس سے بھی زیادہ اہم ریاست کو حکومت پاک و ہند سے ملحق کرنے کا فیصلہ تھا جس کے لیے بڑے سکون واطمینان سے غور وفکر کی ضرورت تھی۔ ان دونوں اہم مسائل کے علاوہ پاکستان سے بھارت کی طرف جانے والے ہندوؤں کی بھگدڑ میں خیر پور کے اقلیتی افراد کی جان ومال کے تحفظ کی تدابیر اختیار کرنا بھی وقت کی اہم ترین ضرورت تھی۔ اور پھر اس اچانک انقلاب کی وجہ سے اندرونی نظم ونسق میں جن خرابیوں کے پیدا ہونے کا احتمال ہو سکتا تھا انھیں بھی حفظ ماتقدم کے طور پر نگاہ میں رکھنا لازم تھا۔ یہ سب ہی ایسے پیچیدہ مسائل تھے جو بغیر انتہا درجہ کی دانائی، حد درجہ استقلال اور غیر معمولی احتیاط کے بیک وقت حل نہیں کیے جا سکتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ ایسا نازک اور دشوار گزار مرحلہ تھا۔ جسے طے کرتے ہوئے بڑے بڑے ضابطہ اور متین انسان کو قدم لڑکھڑا جاتے مگر میر حاجی غلام حسین خان ٹالپور کی استقامت اور ان کی وزیروں کی ہمت اس موقع پر کام آئی۔ چنانچہ سب سے پہلے میر حاجی صاحب اپنے ایک وزیر کو ہمراہ لے کر خیر پور سے کراچی گئے اور قائداعظم کی خدمت میں حاضر ہو کر ریاست خیر پور کے پاکستان سے الحاق کی دستاویز ان کی خدمت میں پیش کی اور اس طرح ریاست خیر پور پاکستان کی تمام ریاستوں سے پہلے مملکت خداداد اسلامی کا ایک جز و قرار دے دی گئی۔

کہ اس کی وزارت کے منصب کا فائل جب قائداعظم کی خدمت میں پیش ہوا تو انھوں نے مسٹر ولیمس کا مجوزہ نام کاٹ کر اس کے بجائے اپنے دست مبارک سے مرزا ممتاز حسن قزلباش کا نام تحریر فرما دیا اور آپ کو خاص پور پر کابل سے بلوا کر خیر پور بھیجا۔ میر صاحب جیسے جہاں دیدہ شخص کی دوررس نگاہیں۔ قزلباش کی ان صلاحیتوں کو دیکھ رہی تھیں جو تعمیر خیر پور کی مختلف منزلوں میں بروئے کار آئیں۔

قائداعظم کی تین امانتیں

یہی وہ حقیقت ہے جس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے صاحبزادہ میر خان محمد خان ٹالپور (سابق پریزیڈنٹ ریاست خیر پور) نے 25 دسمبر 1953ء کو یوم قائداعظم کے موقع پر اپنی تقریر میں کہا تھا کہ:

''قائداعظم پورے پاکستان کے پاس اپنی دو امانتیں اور ہمارے پاس تین امانتیں چھوڑ گئے ہیں۔ اوّل مسلم لیگ، دوسرے پاکستان تیسرے قزلباش''۔

ورود قزلباش کے وقت خیر پور کا آئینی نظام

جب قزلباش قائداعظم کے ایما سے وارد خیر پور ہوئے ہیں اس وقت یہاں میر علی ڈنا (ڈنو) خاں پریزیڈنٹ کے منصب پر فائز تھے۔ شیخ بہاؤالدین وزارت کے فرائض انجام دیے تھے اور خان بہادر قلاب والا کونسل کے رکن اور ایڈوائزر تھے۔ قزلباش کے آنے پر شیخ صاحب کو وزیر کے طور پر برقرار رکھا گیا مگر کونسل کی تجویز سے خود انھیں بجائے منسٹر کے چیف منسٹر کہا جانے لگا اور ''حکمراں کے اختیارات'' کو چھوڑ کر دوسرے پورٹ فولیو۔ (محکمہ مال اور لا اینڈ آرڈر) ریاست کے پریزینٹ نے قزلباش کے حوالے کر دیے۔ ان محکموں کے علاوہ آبکاری کا محکمہ بھی انھیں کے چارج میں دے دیا گیا تھا۔ شیخ بہاؤالدین نے وزارت کے علاوہ کچھ عرصہ جوڈیشل کمیٹی کے صدر کا فریضہ بھی انجام دیا۔ ریاستی کونسل کے یہ ارکان عوام کی منتخب کردہ مشیر اسمبلی قائم ہونے تک برقرار رہے۔ البتہ کرسی صدارت کے لیے ہر سال نیا انتخاب حسب معمول عمل میں آتا رہا۔

طرف سے، میں آپ کو حکمرانی کے پورے اختیارات سپرد کر رہا ہوں۔ خدا کرے پاکستان کی اس ریاست کے لیے اور ریاست کے باشندوں کے لیے یہ تقریب ایک شاندار زندگی کی ابتدا ثابت ہو۔ ریاست خیر پور کی تاریخ 1784ء سے شروع ہوئی ہے۔ یہ وہ سال ہے جبکہ میر سہراب خان ٹالپور نے اپنے خاندان کے لوگوں کی مدد سے کلہوڑا حکمرانوں کو زیر کیا تھا اور ریاست کی بنیاد ڈالی تھی۔ میر سہراب خان ٹالپور کے قابل جانشینوں نے ہوشمندی سے حکومت کی اور رعایا کے فائدے اور انتظامی مصلحتوں کا بہت زیادہ خیال رکھا۔ مجھے خوشی ہے کہ ان اچھی روایات کو بورڈ آف ریجنسی نے جس میں حکمران خاندان کے خاص صاحبزادگان ہیں، گزشتہ چار سال میں بدستور قائم رکھا۔ آپ اس بات پر فخر کریں تو بجا ہے کہ آپ کی ریاست ان ریاستوں میں سے ہے جنھوں نے پاکستان میں شامل ہونے کا شروع ہی میں اعلان کیا اور جنھیں قائداعظم کی خوشنودی حاصل تھی۔ مجھے یاد ہے کہ بورڈ آف ریجنسی کے پہلے صدر صاحبزادہ میر غلام حسین خان ٹالپور اس مقصد سے کئی بار کراچی آئے تھے۔ میں اس تمام مدت میں صاحبزادگان اور آپ کے وزیر اعلیٰ کی اچھی خدمات سے بخوبی باخبر رہا اور میں ان سب کو ان کے حسن انتظام اور کارگزاری پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ اس امر کے اظہار میں مجھے خوشی محسوس ہوتی ہے کہ حکومت کے کام میں عوام کو شریک کرنے میں آپ کی ریاست خیر پور کسی سے پیچھے نہیں ہے۔ پاکستان میں یہ امتیازی خصوصیت آپ ہی کی ریاست کو حاصل ہے کہ یہاں ''بالغوں کے حق رائے دہی'' کی بنا پر انتخابات ہوئے دیکھ کر بڑا اطمینان ہوا کہ گزشتہ سال جس ریاستی مجلس کی رسم افتتاح میں نے ادا کی تھی وہ اب اطمینان بخش طور پر کام کر رہی ہے اور یہ انتخابات کا تجربہ کامیاب رہا۔ ریاست کی نظامت اور مرکزی حکومت کے درمیان گہرا تعاون رہا اور انھوں نے مل کر ریاست خیر پور کو روشن خیالی اور ترقی کی منزل کی طرف بڑھایا۔ اب آپ کا خاص کام یہ ہوگا کہ وہ تدبیریں کریں جن سے ریاست کی

حضور والا!

اب میرے کاندھوں پر آپ نے ذمہ داریوں کا بھاری بوجھ رکھ دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ مجھے آپ کی رہنمائی اور عوام کے تعاون سے ان ذمہ داریوں کو پورا کرنے میں کامیاب فرمائے۔ پاکستان سے الحاق کے بعد مرکزی حکومت سے خیر پور کو جو امداد ملتی رہی ہے اس کے لیے میں آپ کا شکر گزار ہوں۔ مجھے امید ہے کہ امداد و تعاون کا یہ سلسلہ جاری رہے گا تا کہ اہل خیر پور الحاق پاکستان سے پورا پورا فائدہ اٹھا سکیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ مجھے وقت کے اہم تقاضوں کا پورا پورا احساس ہے۔ میں جانتا ہوں کہ ریاست کی ترقی اور خوش حالی کا دارومدار عوام کے تعاون پر ہے۔ اس لیے میں یہ اعلان کرتے ہوئے فخر محسوس کرتا ہوں کہ میری حکومت جمہوریت کے سنہرے اصول پر عمل پیرا ہوگی میں اس وقت ان ہنگامی حالات کا ذکر کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں جن سے پاکستان اس وقت گزر رہا ہے۔ ہمارے محبوب ملک کی سلامتی کے لیے خطرناک صورت حالات پیدا کی جا چکی ہے اور یہ بتانے کی چنداں ضرورت نہیں ہے کہ ایسی خطرناک صورت حال میں اہل پاکستان کا فرض کیا ہو سکتا ہے۔ بہر حال میں یہ اعلان کرتا ہوں کہ دفاع پاکستان کے لیے ہم اپنا آخری قطرہ خون تک بہانے کے لیے تیار ہیں۔ مجھے امید ہے کہ پاکستان کی ترقی کے منصوبوں میں ریاست خیر پور کو بھی فائدہ اٹھانے کا پورا پورا موقع دیا جائے گا۔ خیر پور میں سیم کی وجہ سے زرعی ترقی کے لیے زبردست خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ جس کا مقابلہ کرنے کے لیے امید ہے کہ مرکزی حکومت ہماری ہر ممکن امداد کرے گی۔

خیر پور کی پہلی جمہوری حکومت کا دور

جمہوریت کے قیام سے ریاست کے ہر شعبے میں ہمہ گیر ترقی ہوئی۔ ترقیات اور اصلاحات کے منصوبے قزلباش نے پہلے ہی سے مرتب کر رکھے تھے۔ ان کو بروئے کار لانے کے لیے رفقائے کار کی ضرورت تھی۔ جمہوریت کے نفاذ سے یہ کمی بھی پوری ہو گئی اور ترقیات کی مشینری

اردو میں تقریر کی جا سکے گی۔ لیکن اسپیکر کو یہ اختیار ہوگا کہ وہ کسی ممبر کو کوئی دوسری زبان بھی بولنے کی اجازت دے دے۔ ریاست کا سالانہ بجٹ اسمبلی کے سامنے پیش کیا جائے گا اور کھلے ایوان میں اس پر بحث ہو سکے گی۔ ہز ہائی نیس بہادر کے وزیروں کی ایک کونسل ہوگی جو اسمبلی کے ممبران میں سے منتخب کیے جائیں گے۔ یہ وزرا اسمبلی کے سامنے جواب دہ ہوں گے۔ وزیراعلیٰ جس کا تقرر ہز ہائی نیس بہادر گورنر جنرل پاکستان کی منظوری سے کریں گے۔ ہز ہائنس کا چیف ایڈوائزر ہوگا اور وہی کونسل کا صدر رہے گا۔ وزیراعلیٰ کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ اسمبلی کا ممبر ہو۔ اور نہ اسے اسمبلی کے سامنے جواب دہ ہونا ضروری ہے۔ لیکن یہ امید کی جاتی ہے کہ وہ منتخب شدہ وزیروں سے تعاون کرے گا۔ ہز ہائی نس کی مخصوص ذمہ داریاں ہیں جن کے لیے وہ اپنی ذاتی رائے اور قوت فیصلہ کو استعمال کریں گے۔ ایسی صورت میں وہ گورنر جنرل پاکستان کی ہدایات کو ملحوظ رکھیں گے۔ نیز وزیراعلیٰ خیرپور سے بھی مشورہ کرلیں گے اور اختلاف رائے کی صورت میں گورنر جنرل پاکستان کے مشورہ پر عمل کیا جائے گا۔ ہز ہائی نیس کو اختیار ہوگا کہ مخصوص حالات میں جب کہ مجلس قانون ساز کا اجلاس نہ ہو، گورنر جنرل کی صوابدید سے وقتی ضرورت کے تحت قوانین نافذ کردیں لیکن ایسے قوانین کا بعد میں اسمبلی کے سامنے پیش کیا جانا ضروری ہوگا۔ سابقہ اسمبلی کو جن چیزوں میں دخل دینے کا حق حاصل نہیں تھا وہ پابندیاں ختم کردی گئی ہیں اور اب جملہ امور کا بہ شمول مالیات اسمبلی میں پاس ہونا ضروری ہے۔ پبلک سروس کمیشن کے قیام اور سول ملازمین کے حقوق کی رعایت ملحوظ رکھی جائے گی۔ ہائی کورٹ چیف جسٹس اور اکاؤنٹنٹ جنرل کا محکمہ بھی اس دستور کی روشنی میں قائم کیا جائے گا۔ ہائی کورٹ کی تمام کارروائی سندھی اردو یا انگریزی میں ہوگی۔ دستوری مشینری کے فیل ہوجانے کی صورت میں ہز ہائی نیس بہادر گورنر جنرل کی اجازت سے خود انتظامات سنبھال سکتے ہیں مجموعی طور پر اس دستور کا نفاذ خیرپور کو دوسرے یونٹوں کے برابر اور پاکستان کی فیڈرل حکومت سے مکمل طور پر وابستہ کردے گا۔ شاہی خاندان کے لیے جو خصوصی مراعات تھیں وہ اب باقی نہیں رہیں گی اور ہز ہائی نیس اپنے اختیارات کے استعمال میں حکومت پاکستان پر نظر رکھیں گے۔ وزیراعلیٰ کے لیے گو یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ منتخب ہو۔ تاہم وہ اپنے رفقائے کار سے صلاح و مشورہ کرے گا اور عوام کی خواہش کو جس کا اظہار عوام کے نمائندوں نے کیا ہو ملحوظ رکھے گا۔ خیرپور کا یہ نیا دستور صرف عبوری دور کے لیے ہے جو پاکستان کا دستور مرتب ہونے تک نافذ رہے گا۔

چند سال قبل دیہات کے باشندوں کے مشورے اور ان کی رضامندی سے حکومت نے ایک حکم جاری کیا تھا جس کا مفہوم یہ تھا کہ مختلف دیہاتوں کے مابین نیز دیہات کو پختہ سڑکوں سے ملانے کے لیے خام راستے بنا دیے جائیں اور اس مقصد کے لیے بلا معاوضہ اراضی حاصل کی جائے۔ اس سال حکومت نے بڑی حد تک اس تجویز کو عملی جامہ پہنا دیا ہے، دیہات کے باشندوں نے بہت سے راستے رضاکارانہ طور پر تیار کیے ہیں اور اس کام کو ترقی دیہات کے منصوبے میں شامل کر لیا گیا ہے۔

مہمان خانے

قومی اخبارات میں ریاست کی ترقیات کا مطالعہ اکثر سیاحوں اور مسافروں کے جذبہ شوق کو ابھارتا ہے اور خیر پور کی سیر و سیاحت کا اشتیاق پیدا کرتا ہے۔ اس کے علاوہ مرکزی فوجی سڑک ریاست میں سے گزرتی ہے جس پر سفر کرنے والے سیاح بھی مستقر کی سیر کے خواہش مند ہوتے ہیں مگر ان کے قیام کے لیے شہر میں کوئی ہوٹل ابھی تک نہیں کھولا گیا۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے حکومت نے تین ڈاک بنگلے تعمیر کرا دیے ہیں جن میں مسافروں کے لیے ہر قسم کی آرائش کے اسباب مہیا ہیں۔

گورنمنٹ فیض پریس

میر فیض محمد خاں اول کے دور حکومت میں 1914ء میں قائم ہوا اور اپنے بانی کے نام کی نسبت سے ''فیض پریس'' کہلایا۔ ابتداً مشینوں کی تعداد دو سلنڈر، ایک ٹریڈل اور ایک کٹنگ مشین تک محدود تھی جس میں سندھی اور انگریزی کی معمولی طباعت ہوتی تھی، پریس بغیر کسی اضافہ کے 1949ء تک ریاست کے ضروری فارم چھاپنے کا کام انجام دیتا رہا، دفاتر کے لیے اسٹیشنری مہیا کرنے کا کام بھی اسی کے سپرد تھا۔ پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد اس کی اہمیت میں اس قدر اضافہ ہوا کہ ریونیو اسٹامپ بھی یہیں چھاپے جانے لگے۔ تاہم اعلیٰ قسم کی چھپائی کے لیے کراچی کے پریسوں کی جانب رجوع کرنا پڑتا تھا۔ 1950ء میں مرزا ممتاز حسن قزلباش چیف منسٹر نے جو ریاست خیر پور کو نمونہ کی ریاست بنانے کی مہم شروع کر چکے تھے دوسرے شعبوں کی طرح اس پریس کو بھی اعلیٰ معیار پر لانے کا ارادہ کیا اس مقصد کی تکمیل کے لیے اول آپ نے سید احمد رضا صاحب (موجودہ منیجر فیض پریس) کو جو ریاست کے انجینئرنگ ورکس اور اسٹورز کے انچارج تھے

پہنچیں اور بھی کئی نئی عمارتیں تعمیر کرائی ہیں جن مین محلہ علی مراد سے متصل اسٹاف کے کوارٹرز اس سے تھوڑی دور پر نمائش گاہ مال روڈ پر روہڑی جاتے والی ریلوے لائن کے کنارے زنانہ کلب اور اسی کے پاس وزرا کے بنگلے پرانے بس اسٹینڈ کے قریب ہوٹلوں کے سامنے نیز زنانہ اسپتال کے عقب میں مہاجروں کے لیے شاندار کانیں اور صنعتی علاقے میں فیض پریس کی شان دار عمارت خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

ان عمارات کے علاوہ ایک سکھر روڈ پر اور دوسری طرف کوٹ ڈی جی روڈ پر سرکاری ملازمین کے لیے کالونی کی صورت میں بنگلے اور کوارٹر تعمیر کرائے جا رہے ہیں، اسی طرح وسط شہر میں حبیب بینک کے سامنے زنانہ اسکول اور نوٹی فائڈ ایریا کے بالمقابل زنانہ صنعتی اسکول عنقریب تعمیر ہیں۔

حکومت کے علاوہ عوام نے بھی اس مدت میں بہت سے نئے مکانات بنوائے ہیں جن سے شہر کی رونق میں کافی اضافہ ہوگیا ہے۔

اصلاح دیہات

دیہات میں اس سال عام اصلاحات کے علاوہ تعلیم بالغاں اور لڑکیوں کی تعلیم کے اسکول حکومت کی جانب سے قائم کیے گئے ہیں جن میں لڑکیوں کو اس قسم کی دستکاری سکھائی جارہی ہے جس سے وہ گاؤں میں بیٹھ کر کسب معاش کرسکیں۔ اچھی نسل کی مرغیاں پالنے اور ان کی نسل اور انڈوں سے منتفع ہونے کے کاروبار کو بھی دیہات میں رواج دیا گیا ہے اس سلسلے میں حکومت نے گرم پانی سے چلنے والی ایک مشین دیہاتی عوام کے لیے خریدی ہے جو بغیر مرغی کے انڈوں سے بچے نکالتی ہے اس مشین سے اچھی نسل کی مرغیوں کے بچے نکال کر دیہات میں تقسیم کیے گئے ہیں، کئی دیہات میں محکمہ ولیج ایڈ نے مزارعین کے کلب قائم کیے ہیں جن میں اخبارات اور کتابیں فراہم کیے گئیہیں اور نئی قسم کے کھیلوں کا سامان مہیا کیا گیا ہے۔ سال بھر کی قلیل مدت میں دیہات کے لوگ اس منزل پر آپہنچے کہ اب وہ شہروں میں جاکر کرکٹ اور ہاکی کے میچ کھیلتے ہیں اور اکثر جیت کر واپس آتے ہیں۔

توسیع زراعت کے لیے پوری ریاست میں ولایتی کھاد کا ہفتہ منایا گیا ہے جس کے باعث اس دفعہ کوئی چھوٹے سے چھوٹا گاؤں بھی ایسا باقی نہیں رہا جس کے کاشتکاروں تک اس کھاد کا چرچا

نہ پہنچ گیا ہو۔

نارے کے غیر مزروعہ علاقے کو قابل کاشت بنانے اور اسے مزارعین میں تقسیم کرنے کا کام حکومت کی جانب سے شروع کر دیا گیا ہے، تقریباً دو لاکھ کی تقاوی ورجینیا تمباکو کی کاشت کے سلسلے میں کنویں اور بھٹیاں بنانے کے لیے تقسیم کی گئی ہے، ترقیات دیہی کے سلسلے میں ہر تعلقہ میں کسانوں اور زمینداروں کی ایک کونسل بنوائی گئی ہے جو اپنی ضروریات اور تقاضوں کے مطابق ترقی دیہات کا پروگرام بنا رہی ہے۔

صحت عامہ

گزشتہ سال تک آنکھوں کے مریضوں کا علاج کرنے کے لیے ہر سال ایک ڈاکٹر مسٹر ہالینڈ کوئٹہ سے معینہ اور محدود مدت کے لیے خیر پور آیا کرتے تھے، اس سال حکومت نے سول اسپتال خیر پور میں آنکھوں کے علاج کا مستقل شعبہ کھول کر اس کے لیے ایک سند یافتہ ماہر فن کی خدمات حاصل کر لی ہیں۔

ٹیلی فون

خیر پور کے بڑھتے ہوئے کاروبار کے پیش نظر اب یہاں کے باشندوں کو پاکستانی شہروں سے ایک ایسا رابطہ قائم کرنے کی ضرورت تھی جس سے یہ ہر وقت وہاں کے کاروبار اور تجارت کے لحہ لحہ بدلتے ہوئے حالات سے باخبر رہیں، حکومت خیر پور نے بروقت اس ضرورت کو محسوس کر کے ٹیلی فون کے مرکزی محکمہ سے خیر پور میں ٹیلی فون نصب کیے جانے کی تحریک کی۔ چنانچہ جون 1954ء میں ایک سو کے قریب ٹیلی فون خیر پور میں نصب کر دیے گئے اور بہت سے مزید نصب کیے جانے والے ہیں۔

اجارہ کی معافی

ماہ اکتوبر میں تجارتی کاروبار کی ترقی کے پیش نظر باہر سے خیر پور میں لائے جانے والے سامان تجارت پر اجارہ معاف کر دیا گیا۔

موجودہ حکومت کے منصوبے

محکمہ اطلاعات عامہ خیر پور اور دیگر معتبر سرکاری وسائل سے یہ معلوم ہو کر مستقبل کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہونے کی توقع ہے کہ حکومت خیر پور نے صرف مذکورہ ترقیات پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس کے سامنے ابھی چند مفید منصوبے اور بھی ہیں جن میں سے بعض اس وقت تکمیل کی منزلوں سے گزر رہے ہیں اور بعض ایسے ہیں جن کو کچھ دن کے بعد عملی جامہ پہنانا شروع کیا جائے گا مثلاً

قومی ٹیکسٹائل مل میں ایک چھوٹی مل کے قیام کی منظوری دے دی ہے جو پچیس ہزار تکلوں اور پانچ سو کرگھوں سے کام کرے گی جو ریاست میں اعلیٰ درجہ کی باریک ململ اور دوسرا فائن سوتی کپڑا تیار کرے گی۔

سردست قومی مل کی خراب روئی سستے داموں میں بیچ دی جاتی ہے اس خراب روئی سے موٹا سوت تیار کرنے کے لیے مزید پانچ سو تکلے نصب کیے جائیں گے۔

ایک آئل مل کے قیام کا عظیم منصوبہ بروئے کار لائے جانے کے انتظامات مکمل ہو گئے ہیں جس میں 8 گھنٹے کی ہر شفٹ میں دس ٹن تیل نکلے گا یہ مل پچیس لاکھ کے سرمایہ سے قائم ہوگی۔

بناسپتی گھی اور صابن بنانے کی ایک بڑی فیکٹری کے قیام کی ابتدائی منزلیں طے ہو چکی ہیں۔ یہ فیکٹری شخصی سرمایہ سے قائم کی جا رہی ہے، وہ جماعت جس نے اس کی منظوری حاصل کی ہے پچاس لاکھ روپے کا سرمایہ لگائے گی، جس میں سے پچیس لاکھ فوراً صرف ہوگا۔ حکومت بھی اس منصوبے میں شریک رہے گی۔

انگریزوں کی ایک جماعت نے ریاست میں ہڈیوں کا کارخانہ کھولنے کی اجازت حاصل کی ہے اور اس کارخانے کے قیام کی کئی منزلیں اب تک طے ہو چکی ہیں۔

مختلف جماعتوں نے روئی کے کپڑے کا کارخانہ، مصنوعی ریشم کے کپڑے کا کارخانہ اور ایک موزہ فیکٹری کھولنے کی درخواست کی ہے۔ جس کی انھیں اجازت دے دی گئی ہے۔

رنگ وارنش کا کارخانہ بڑے پیمانے پر، جوتے کا کارخانہ، بجلی کے سامان اور آلات کا کارخانہ، ربڑ کا کارخانہ، دواسازی کا کارخانہ، سوڈا صاف کرنے اور ملتانی مٹی کے استعمال کرنے

کے دیہات دیکھنے پر معلوم ہوا کہ یہاں کے دیہی علاقوں کا معیار زندگی بہت
بلند ہو چکا ہے''۔

.................☆☆☆.................

اکتوبر 1954ء میں مسٹر علیم وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی وارد خیر پور ہوئے اور انھوں نے کہا:

''خیر پور میں ابتدائی اور ثانوی اسکولوں کی تعداد یہاں کی آبادی کے
اعتبار سے دوسرے پاکستانی مقامات کے مقابلہ میں زیادہ ہے''۔

.................☆☆☆.................

اکتوبر 1954ء میں ہز ایکسی لینسی گورنر سندھ نے خیر پور کے صنعتی اداروں کا معائنہ کیا اور خیر پور کی شش سالہ صنعتی اور معاشی ترقیوں سے بہت زیادہ متاثر ہوئے اور کہا کہ:

''خیر پور نے اس دور میں حیرت انگیز ترقی کی ہے''۔

.................☆☆☆.................

نومبر 1954ء میں وزیر زراعت مصر نے خیر پور کا دورہ کیا اور یہاں کی زرعی اصلاحات کو دیکھ کر اخبار مراد کے نمائندے سے کہا کہ:

''میں اس چھوٹے سے علاقے کی زراعتی ترقیوں کا گہرا نقش دل پر
لے کر واپس جا رہا ہوں''۔

.................☆☆☆.................

28 نومبر 1954ء کو مسٹر کھوڑو (وزیر اعلیٰ سندھ) اور مولا بخش سومرو/ وزیر سندھ وارد خیر پور ہوئے۔ وزیر موصوف نے ''مراد'' کے نمائندے کو بیان دیتے ہوئے کہا کہ:

''خیر پور ہم سے زیادہ ترقی یافتہ ہم سی زیادہ مطمئن ہم سے زیادہ عوام کا
خدمت گزار اور ہم سے زیادہ مضبوط ہے۔ ہم ہاریوں کی خوش حالی کے
منصوبے بنا رہے ہیں اور خیر پور عملاً ان کا بوجھ کم کر چکا ہے۔ خیر پور دیگر
اسباب و وسائل سے کام چلا رہا ہے اور ہم ابھی زرعی مال گزاری پر تکیہ کیے
ہوئے ہیں ہم نے خیر پور کو اپنے سے بہتر سمجھ کر ون یونٹ کے مسئلے میں اس کی

تاتی کی ہے"۔

☆☆☆

اوائل دسمبر میں امریکی ماہر زراعت مسٹروان نے موری ببرلو کے دیہات کا معائنہ کیا اور وہاں دیہاتی کلب اور دیہی لڑکیوں کے دستکاری اسکول کی مصنوعات دیکھ کر کہا کہ:

"ان دیہات میں اسی طرح کام ہوتا رہا تو یہاں کے لوگ بہت جلد کہیں سے کہیں جا پہنچیں گے"۔

☆☆☆

دسمبر میں مشرقی پاکستان کا خیر سگالی وفد خیر پور میں آیا۔ وفد کے ارکان نے اسکول کے بچوں کو ملٹری ٹریننگ پاتے ہوئے دیکھ کر کہا کہ:

"یہ پاکستان میں پہلی مثال ہے"۔

وفد کے ممبران نے ریاست کی صنعتی ترقیات اور مصنوعات سے گہری دلچسپی لیتے ہوئے کہا کہ:

"ہم یہاں کے محکمہ صنعت کے کارکنان کو اپنی دلی مبارک باد کا مستحق سمجھتے ہیں"۔

27/ دسمبر 1952ء کو میجر جنرل اسکندر مرزا وزیر داخلہ پاکستان وارد خیر پور ہوئے۔ آپ نے یہاں کے صنعتی اداروں کا معائنہ کیا، اور ٹیکسٹائل مل کے تمام شعبوں اور مشینوں کو غیر معمولی دلچسپی اور شغف سے دیر تک دیکھتے رہے اور آخری میں چند مختصر مگر جامع الفاظ میں اپنے تاثرات قلمبند فرمائے:

"مجھے آج اعلیٰ درجے کی ٹیکسٹائل مل کو دیکھنے کا موقع ملا ہے"۔

خیر پور اور اردو علم و ادب

اس عنوان کے تحت عبدالحسین جعفری اکاؤنٹنٹ جنرل خیر پور اسٹیٹ نے خیر پور کی اردو کانفرنس کے اجلاس منعقدہ فروری 1952ء میں ایک مقالہ پڑھا تھا جو اس موضوع پر روشنی ڈالنے کے لیے کافی ہے۔ اس مقالہ میں کہا گیا تھا کہ سندھ کے علاقہ میں خیر پور کی

سیم اور روہڑی کینال کا مسئلہ

ریاست کے وسط سے روہڑی کینال گزرتی ہے۔ نہر کا پانی رسنے کی وجہ سے ایک وسیع رقبہ سیم زدہ ہوگیا ہے، اس نقص کو دور کرنے کے لیے تدابیر کے ضمن میں حکومت سندھ کو حکومت خیرپور سے اختلاف ہے۔ یہ نہر ریاست کے زرخیز ترین رقبہ میں سے گزرتی ہے اندرون ریاست نہر کی لمبائی پچاس میل ہے جو 1831ء میں نکالی گئی ہے۔ ایک سال کے کم عرصہ میں نہر کے پانی نے تقریباً 10 مربع میل ساحلی علاقے کو سیم زدہ کردیا ہے۔ جب سے زمین دوز پانی کی سطح متواتر بلند ہورہی ہے اور فی الحال بعض اطراف میں ایک میل دور تک تو پانی کی سطح زمین کی سطح تک بلند ہوگئی ہے۔ فی الحال سیم کا پانی ریاست کے ہر بڑے شہر مثلاً خیرپور، لقمان، گمبٹ، کھوڑا، رانی پور، ٹھارجہ، ٹنڈو مستی خاں اور دیگر مقامات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ کم سے کم تین میل تک نہر کے دونوں طرف کے مکانوں اور اراضی کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا، ان علاقوں کے سیکڑوں خاندان بے خانماں ہوگئے اور ان کی گزراوقات کا ذریعہ (یعنی مزروعہ زمین) سیم نے بیکار کردیا۔ ریاست کی حکومت نے اور سیم زدہ علاقے کے باشندوں نے اس ضمن میں بے حد خرچ کیا آئے دن اس بلائے ناگہانی کی وجہ سے سرکاری اور نجی عمارتوں کی مرمت نیز سیم زدہ علاقوں سے پانی کے اخراج پر بے اندازہ روپیہ خرچ کرنا پڑتا ہے، اور اب یہ اندیشہ پیدا ہوچلا ہے کہ کہیں خیرپور کا صنعتی علاقہ اور دوسرے شہر بھی اس عذاب میں مبتلا نہ ہوجائیں۔ ٹیکسٹائل مل کے چاروں طرف کی زمین کا یہی حال ہے۔ سیم اس قدر تیزی سے پھیل رہی ہے کہ ریاست کا مستقبل نہایت تاریک معلوم ہوتا ہے۔ سال گزشتہ بین الاقوامی ماہرین نے سیم زدہ علاقوں کا مشاہدہ کرنے کے بعد اس خیال کی تائید کی ہے۔ ذیل میں ڈاکٹر ڈبلیو۔ جے۔ این۔ بلم اٹیسن کے بیان کا اقتباس درج کیا جاتا ہے جو مٹی اور پانی کے زبردست ماہر اور حکم تسلیم کیے جاتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ:

خیرپور میں نہر کی دو شاخوں کے درمیانی علاقہ کی زمین سے زیادہ زرخیز خطہ دریائے سندھ کی وادی میں کہیں نہیں پایا جاتا۔ لیکن دو سببوں سے پیداوار کافی نہیں ہوتی۔ پہلا سبب پانی کی قلت اور دوسرا سبب پانی کی بے حد کثرت جو روہڑی کینال نے پیدا کی ہے۔ یہ بے حد وسیع نہر اس نہایت زرخیز علاقہ کے وسط سے گزرتی ہے۔ اس نہر کا پانی ایک میل میں اتنی زیادہ مقدار میں

انھیں تحصیلدار مقرر کر دیا۔ 13 جنوری 1902ء کو اس عہدے پر مستقل ہو گئے۔ 1906ء میں ڈپٹی کلکٹر ہوئے۔ 24 مئی 1914ء کو ریاست خیر پور کی وزارت کا منصب تفویض کیا گیا اور چھ سال تک فرائض منصبی بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیتے رہے۔ 1916ء میں ہز ہائی نیس میر امام بخش خاں ٹالپور سے بعض معاملہ پر ان سے اختلاف رائے ہوا۔ اس لیے وزارت سے استعفیٰ دے کر چلے گئے۔ میاں صاحب نے اپنی قلیل مدت وزارت میں رفاہ عامہ کے بہت سے کام کیے۔ نئی نئی سڑکیں اور مسجدیں تعمیر کرائیں، سرکاری دفتر بنوائے، لوہے کا ایک کارخانہ آپ ہی کے عہد میں کھولا گیا۔ پارچہ بانی کے کارخانے جاری کیے گئے، نمونے کا زراعتی فارم بنایا گیا۔ میر واہ میں ریگو لیٹر لگوایا گیا، ریاستی فوج از سر نو منتظم کی گئی، کیڈٹ کور کا بندوبست کیا گیا۔ زنانہ اسپتال قائم ہوا، برقی روشنی شروع کی گئی، انگریزی اسکول کو ہائی اسکول کے درجہ تک پہنچایا گیا۔ 1919ء میں آپ کی سرگرمیوں سے خیر پور میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس منعقد ہوا، جس میں دور دور کے قومی کارکن خیر پور آئے۔

شیخ محمد قادر

شیخ صاحب 12 جون 1876ء کو بمقام سورت پیدا ہوئے۔ بمبئی یونیورسٹی سے بی اے اور پھر ایل ایل بی کا امتحان پاس کیا۔ 27 اپریل 1901ء سے سرکاری ملازمت شروع کی۔ 1911ء تک محکمہ نمک، پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ اور محکمہ مال گزاری میں چھوٹی موٹی خدمات انجام دیتے رہے بعدازاں قائم مقام ڈپٹی کلکٹری کے عہدے پر سرفراز ہوئے۔ 1911ء میں ان کی خدمات سندھ میں منتقل کر دی گئیں۔ پہلے تحصیلدار پھر کمشنر سندھ کے میر منشی مقرر ہوئے۔ 1915ء میں السنہ شرقیہ کے مترجم کی خدمت سپرد ہوئی۔ 15 جولائی 1920ء کو خیر پور کے وزیر مقرر کیے گئے۔ اسی زمانے میں انھیں ان کی جنگی خدمات کے صلے میں جو انھوں نے 1914ء کی جنگ عظیم میں انجام دی تھیں ایم بی اے (ممبر آف برٹش ایمپائر) کا اعزاز ملا۔ شیخ صاحب نے بھی ریاست میں وزرائے سابق کی روایات کو برقرار رکھا۔ چنانچہ آپ کے عہد وزارت میں آٹھ ہزار ایکڑ ناقابل کاشت زمین زیر کاشت لائی گئی۔ مزارعین کی امداد کے لیے کوآپریٹو ایکٹ نافذ کیا گیا جس کے تحت بہت سی امدادی انجمنیں قائم ہو گئیں۔ ایک لاکھ کے صرفہ سے علی نواز نہر نکالی گئی جس سے اور

سب سے زیادہ قابل تعریف آپ نے دو کام کیے۔ اول یہ کہ ریاست میں آنے کے بعد آپ نے بہت جلد یہ محسوس کرلیا کہ یہاں کے مقامی طبقے میں تعلیم کی کمی ہے جس کے باعث وہ اس وقت تک حسب تنخواہ ترقی نہیں کرسکتے جب تک یہاں پڑھے لکھے لوگوں کی ایک سوسائٹی نہ پیدا کردی جائے۔ چنانچہ اسی نظریہ کے تحت آپ نے باہر سے قابل لوگوں کو ریاست میں بلوانا شروع کیا۔ چنانچہ خواجہ السبطین پانی پتی، مولوی اعزاز عالم بی اے ایل ٹی ریٹائرڈ ہیڈ ماسٹر، آغا تاج محمد (ڈی پی آئی)، مسٹر مہیش دتا۔ (آوٹ افسر)، خان بہادر عبدالقیوم احمد (آئی جی پی)، تنویر احمد صدیقی (نائب ناظم پولیس)، مرزا محمد باقر (چیف جج)، مولوی رفیع عالم (سابق اتالیق ہزہائی نیس بہادر میر علی مراد خاں ٹالپور خاں پرنسپل نازہائی اسکول) اور ایسے ہی دوسرے لائق حضرات آپ کی تحریک سے ریاست میں آئے اور اصلاح وترقی کی کوششوں کو چار چاند لگا دینے کا ذریعہ بنے۔

آپ کا دوسرا کارنامہ یہ تھا کہ اگرچہ ریاست میں آپ سے پہلے انگریز وزیر سلیڈن وغیرہ کا عمل دخل رہا تھا، مگر چونکہ وہ دراصل ریاست کو ترقی نہیں دینا چاہتے تھے، اس لیے یہاں کے دفاتر میں ڈسپلن اور پابندی وقت مفقود تھی جس کے باعث عوام کے ضروری کام عرصہ تک ٹیبل کی زینت بنے دفتروں میں پڑے رہتے تھے۔ خان بہادر نے خود وقت کی پابندی کی اور بغیر اطلاع کے مختلف دفاتر کا دفتر کھولے جانے کے اوقات میں دورہ کرنے لگے اور ہر دورے میں جس افسر کو نہ پایا یا بے کار بیٹھے ہوئے دیکھا، اس پر بلا امتیاز اعلیٰ وادنیٰ یکساں طور پر سختی کی، جس سے تمام لوگ بہت جلد پابندی وقت اور کام کرنے کے عادی ہوگئے اور عوام کو اپنا کام معطل پڑے رہنے کے باعث جو تکالیف ہوتی تھیں وہ بھی دور ہوگئیں۔

اس مقام پر یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ سلیڈن کے دور میں بدانتظامی کے باعث ایک دفعہ ریاست کافی مقروض ہوگئی تھی، مگر جس وقت خان بہادر یہاں سے چلے ہیں، اس وقت شاہی خزانے میں ایک کروڑ پانچ لاکھ روپیہ نقد موجود تھا۔

مرزا ممتاز حسن قزلباش

خیر پور اسٹیٹ لجسلیٹو اسمبلی انٹرم کانسٹی ٹیوشن ایکٹ نمبر (6) 1953ء کے نئے انتخابات

کی رو سے مرزا ممتاز حسن قزلباش خیر پور میں سب سے پہلے عوام کے منتخب شدہ وزیر اعلیٰ مقرر ہوئے۔ آپ 1948ء سے وزیر اعلیٰ کے فرائض انجام دے رہے ہیں، حالانکہ پرانے کانسٹی ٹیوشن میں مرزا ممتاز حسن قزلباش اکس آفیشو ممبر کی حیثیت سے وزیر اعلیٰ کی خدمات پر متمکن رہ سکتے تھے لیکن خیر پور کے عوام کی مرزا ممتاز حسن قزلباش نے جو نا قابل فراموش اور ٹھوس خدمات انجام دی ہیں ان کا اعتراف کرتے ہوئے یہاں کے عوام نے ان سے اصرار کیا کہ وہ ان کے نمائندہ کی حیثیت سے اس نئے انتخاب میں کھڑے ہوں اور ان کی رہبری کریں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مرزا ممتاز حسن قزلباش نے خیر پور کے دو حلقوں سے انتخابات میں کھڑے ہونے کا ارادہ کیا اور دونوں حلقوں سے بلا مقابلہ کامیابی حاصل کی، جس سے قزلباش صاحب کی ریاست میں مقبولیت کا بآسانی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ قزلباش کا الیکشن میں حصہ لینے کا مقصد جمہوریت کے اقتدار کو تقویت پہنچانا تھا، اور ہوا بھی یہی کہ قزلباش نے ان انتخابات میں حصہ لے کر یہ ثابت کر دیا کہ انھیں خیر پور کے عوام کی نہ صرف بھاری اکثریت بلکہ سو فی صدی اشخاص کا تعاون حاصل ہے۔

خیر پور اسٹیٹ لجسلیٹو اسمبلی مسلم لیگ پارٹی نے (جو 30 نشستوں میں سے پچیس پر قابض ہے) اپنی پہلی نشست میں کثرت رائے سے مرزا ممتاز حسن قزلباش کو اپنا پارٹی لیڈر منتخب کر لیا۔

قزلباش 1897ء میں بمقام آگرہ پیدا ہوئے اور ایم اے او کالج علی گڑھ اور الٰہ آباد یونیورسٹی سے بی اے کی ڈگری حاصل کی اور بہت ہی جلد صوبہ یو۔ پی کے انتظامی محلوں میں پراونشل سول سروس کے عہدہ پر فائز ہو گئے۔ انھیں یو پی گورنمنٹ نے کونسل آف اسٹیٹ میں اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا۔ جہاں رہ کر قزلباش نے اپنے صوبہ کے لیے دیہی زرعی اصلاحات اور اقتصادی و تمدنی ترقیات کی اسکیمیں منظور کرائیں اور انھیں متعارف اور نافذ کرایا۔

1938ء سے 1942ء تک قزلباش نے دہلی میونسپل کمیٹی کے سیکریٹری کی خدمات بھی بڑی کامیابی اور نیک نامی کے ساتھ انجام دیں۔ ان خدمات کے اعتراف میں گورنمنٹ نے انھیں آئی سی ایس کے سینئر گریڈ میں ترقی دی اور انھیں برٹش ڈیلی گیشن کابل میں کمرشل اٹیچی اور بعد ازاں کمرشل افسر کی خدمات سپرد کر دی گئیں۔ افغانستان میں پاکستان ایمبیسی میں بحیثیت چارج ڈی آفیسرز کے عہدہ پر بھی کچھ عرصہ کے لیے کارگزار رہنے کے بعد 1948ء میں قزلباش کو خیر پور اسٹیٹ کا وزیر اعلیٰ مقرر کر دیا گیا۔ خیر پور کی صنعتی، اقتصادی اور سماجی ترقیاں قزلباش ہی کی

ہیں اور قوم وملت کے ہمدرد ہیں۔ خیر پور میں ''انجمن جعفریہ'' اور علوم عربیہ کا مرکز سلطان المدارس آپ ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔

آپ کی سب سے اعلیٰ خوبی جو ہمیں بہت زیادہ پسند ہے یہ ہے کہ آپ ایک اچھے عہدے پر فائز ہونے کے بعد بھی اپنے بزرگوں کو بزرگ سمجھتے ہیں اور ان کے سامنے سر اٹھا کر بات کرنا ان کے ادب واحترام کے منافی سمجھتے ہیں اور ہمارے خیال سے یہی وہ سعادت مندانہ احساس ہے جس نے آپ کو ہر اعتبار سے ایک کامیاب زندگی کا مالک بنا دیا ہے۔

مسٹر حسن حبیب

آپ آگرے کے رہنے والے ہیں، جو بھارت کا ایک نہایت مردم خیز خطہ اور تاریخی مقام ہے۔ آپ کے والد بزرگوار مرزا حبیب حسن مراد آباد کے گورنمنٹ کالج میں پروفیسر تھے۔ مرزا صاحب نے ایک برطانوی خاتون سے دوسری شادی کرلی تھی جن کے ساتھ رہ کر کم سنی ہی میں حسن حبیب صاحب انگلش میں بے تکان گفتگو کرنے لگے تھے۔ جب پڑھنے کے قابل ہوئے تو آپ کو آگرہ کے سینٹ پیٹرز اسکول میں داخل کر دیا گیا۔ جہاں تمام طلبہ ومدرسین اردو کے بجائے انگریزی میں ہر قسم کی بات چیت کرتے تھے۔ ان وجودہ واسباب سے انگریزی بولنے اور لکھنے میں آپ کو بچپن ہی میں ید طولیٰ حاصل ہوگیا تھا۔ جسے انگریزی کے اہل زبان بھی تسلیم کرتے تھے۔ چنانچہ ایک دفعہ آپ نے اپنے لڑکپن میں انگریزی کی ایک پوئٹری (نظم) تصنیف کی تھی جسے لندن میں بھیج دیا گیا تھا۔ اس نظم کے متعلق جو الفاظ وہاں سے لکھے ہوئے آئے ان کا ماحصل یہ تھا کہ:

> ''اس کم عمری میں اس لڑکے (حسن حبیب) نے جو پوئٹری لکھی ہے وہ ایسی ہے جو کوئن الزبتھ کے عہد کے مستند شعرا ہی کمپوز (تصنیف) کر سکتے تھے''۔

حسن حبیب نے میٹرک سے بی۔اے تک تعلیم کرنے کے بعد انگریزی زبان میں امتیازی حیثیت سے ایم۔اے پاس کیا اور اس کے بعد یوپی میں انسپکٹر مدارس کے عہدے پر مامور ہوئے۔ اس دوران میں آپ نے انگریزی اخبارات اور رسائل کے لیے اتنے زیادہ اور اس قدر اچھے مضامین لکھے کہ بہت جلد آپ کا شمار اعلیٰ معیار کے جرنلسٹوں میں کیا جانے لگا۔

تقسیم ہند کے بعد 1948ء میں ترک ملازمت کر کے پاکستان چلے آئے اور کراچی میں

رکھتے ہیں۔ خیرپوری عوام کے یہی وہ اقدامات ہیں جن سے ان کے سیاسی شعور کا معیار ظاہر ہوتا ہے جس پر گزشتہ اوراق میں ایک مستقل عنوان کے تحت روشنی ڈالی گئی ہے۔

معاونین ''مراد''

مولانا شبیہ الحسنین

مراد کو ترقی دینے میں سب سے پہلی پُرخلوص خدمت مولانا شبیہ الحسنین نے انجام دی اور ملکی وقومی مسائل پر پے در پے کارآمد اور ٹھوس مقالے لکھ کر اخبار کا معیار بلند کرنے میں قابل لحاظ حصہ لیا۔ نیز ان موانع کو دور کرنے میں بھی بڑی پامردی اور دلیری کے ساتھ راقم الحروف کے شریک کار رہے۔ جن کا تذکرہ ''خیرپور کا پہلا اخبار'' کے عنوان کے تحت کیا جا چکا ہے۔

آپ 11 مئی 1917ء کو سرسی ضلع مراد آباد میں پیدا ہوئے، آبائی وطن بدایوں تھا۔ بعد تقسیم خیرپور میں آباد ہوئے اور یہاں ہر قسم کی بے سروسامانی کے باوجود مہاجرین کی آبادکاری میں غیر معمولی طور پر حصہ لیا۔ خیرپور کی شہری زندگی میں آپ کی خدمات ایک نمایاں حیثیت رکھتی ہیں۔ زیر نظر کتاب میں ''ریاست کا عہد زرّیں'' کے عنوان سے جن ترقیات واصلاحات کا ذکر کیا گیا ہے ان میں ریاستی حکومت کی کامیابی کے لیے مولانا نے جس خلوص سے حکومت کے ساتھ تعاون کیا ہے اسے ارتقائے خیرپور کی تاریخ میں ایک ممتاز مقام حاصل رہے گا۔

آپ عصر حاضر کے ایک سحر بیان مقرر ہیں۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں ایسی ساحرانہ تقریر کرتے ہیں کہ مجمع آپ کا دم بھرنے لگتا ہے۔ تقریر کے علاوہ تحریر پر بھی آپ کو کافی اقتدار حاصل ہے۔

مولانا علوم مشرقیہ کے فاضل ہیں درس نظامی کی تکمیل لکھنؤ میں ہوئی۔ تقریر اور تحریر کا جوہر آپ میں فطری طور پر موجود تھا، لڑکپن میں جب آپ نے کالج کے علمی مباحثوں میں تقریر کرتے تھے، تو بسا اوقات آپ کی ترتیب خیالات کے سلیقہ پر شمس العلما مولانا سبط حسن صاحب مرحوم اعلی اللہ مقالہ کی زبان سے بے ساختہ داد نکل جاتی تھی، یہی وہ وصف تھا جس کی بنا پر علامہ مولوی محمد

ہمیشہ اپنی جماعتوں میں ممتاز رہتے ہیں۔ ان کی تہذیب اور نیکی مثال کے طور پر استعمال ہوتی ہے، آپ کا لڑکا محمد حیدر ہاکی کا بہترین کھلاڑی ہے اور بھتیجی ندیم فاطمہ کمسنی کے باوجود تقریر کی صلاحیت کے اعتبار سے پورے پاکستان میں شہرت پا چکی ہے۔ غرض زندگی کے مختلف شعبوں میں آپ کا خاندان آپ کی تربیت کے اثر سے خیر پور کی خدمات کر رہا ہے۔

سید امیر عباس زیدی

مراد کی طباعت اور توسیع اشاعت کے سلسلہ میں زیدی صاحب کی اس محنت اور جانفشانی کو کبھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جو آپ مسلسل ایک سال تک بغیر کسی ذاتی غرض کے کرتے رہے۔ ارباب قلم سے مضامین لکھانا، انھیں سکھر لے جا کر کتابت کرانا مسودات سے کاپی کا مقابلہ کرنا، پھر سکھر ہی سے طباعت کرا کے خیر پور لانا اور یہاں تمام سرکاری دفاتر اور دوسرے خریداروں تک بروقت پہنچوا دینا۔ اخبار کے لیے اشتہارات حاصل کرنا، خریداروں اور مضمون نگاروں سے خط و کتابت کرنا، مراسلات کا پڑھنا اور منتخب کرنا اور خریدار پیدا کرنے کے لیے جگہ جگہ جانا یہ سب کام آپ نے محض قومی خدمت کے جذبہ میں انجام دیے اور کبھی راقم الحروف پر اس کا کوئی احسان نہیں جتایا۔ اس ایثار کو دیکھ کر ماننا پڑتا ہے کہ آپ بلند خیالات اور وسیع نظر کے مالک انسان ہیں اور قوم کی ذہنی تربیت کے اعلیٰ مقصد کو جانتے اور پہچانتے ہیں۔

سید امیر عباس 1914ء میں موضع تجھیڑہ، تحصیل جانسٹھ ضلع مظفر نگر (یوپی) میں پیدا ہوئے، سادات بارہ کے عالی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، فیض عام ہائی اسکول میرٹھ میں تعلیم پائی۔ 1930ء میں یوپی پولیس کے محکمہ میں ملازمت کر لی۔ تقسیم ہند کے بعد ملازمت سے مستعفی ہو کر یکم جنوری 1947ء کو پاکستان میں چلے آئے اور اگست 1948ء میں خیر پور کی مستقل سکونت اختیار کر لی۔ آپ نے مولانا شبیہ الحسنین کی قیادت میں مہاجروں کی آبادکاری کے خیال سے ایک انجمن بنائی اور اس کے ذریعہ آبادکاری میں نمایاں حصہ لیا۔ 1952ء میں جب یہاں خیر پور ماچس فیکٹری قائم ہوئی تو اس کے منتظمین نے ویلفیئر افسر کے عہدے کے لیے آپ کی خدمات حاصل کر لیں۔

آپ بکھرے ہوئے کاموں کو سمیٹنے اور منظم طور پر ہر قسم کی تقریبات کو پایہ تکمیل تک پہنچانے

شکریہ

ابوالحسنین ناطق

زیر نظر تاریخ خیر پور کی تدوین میں دو اشخاص خصوصی طور پر میرے شکریہ کے مستحق ہیں۔ ایک ابوالحسنین ناطق بدایونی۔ جنھوں نے مواد کی فراہمی میں میرا ہاتھ بٹایا۔ حکومت سندھ کے کئی گزٹوں کی عبارت سکھر میونسپلٹی کے کتب خانے سے نقل کر کے لائے۔ خیر پور کے سرکاری گزٹ میں میری لکھوائی ہوئی یادداشت کے مطابق کئی باتیں تلاش کیں۔ شعبہ عدلیہ خیر پور کے ریکارڈ کی چھان بین کی اور جس وقت اپنی لڑکی کے علاج کے لیے کراچی گئے تو وہاں کی ایک شخصی لائبریری میں اخبار نیرِ اعظم مراد آباد کی فائل تلاش کر کے میری ہدایات کے تحت اس کے بعض اجزا نقل کیے اور ان سب خدمات کا میرے اصرار کے باوجود کوئی معاوضہ قبول نہیں کیا۔

آپ بدایوں کے رہنے والے ہیں۔ 1909ء میں بمقام رام پور پیدا ہوئے۔ جہاں آپ کے والد ایک اچھے عہدے پر مامور تھے بدایوں، مراد آباد اور علی گڑھ میں تعلیم پائی۔ تحصیل علم کے بعد سینٹرل ایکسائز کے تمباکو کے شعبہ میں ملازم ہوگئے۔ 1947ء میں اپنی خدمات کو پاکستان کی طرف منتقل کرالیا۔ 1950ء تک لاہور میں پھر سکھر میں تعینات رہے۔ خیر پور کو وطن بنایا۔ 1954ء میں جب ریاست خیر پور نے اپنے یہاں ورجینیا تمباکو کی کاشت شروع کروائی تو اس وقت مرکزی حکومت سے آپ کی خدمات حاصل کریں۔ آج کل آپ خیر پور کے اسی محکمہ میں کام کررہے ہیں۔

شعروسخن اور اردو ادب سے خاص شغف رکھتے ہیں۔ دو ایک کتابیں بھی تالیف کی ہیں۔ شعر بچپن سے کہتے ہیں اور احسنؔ مارہروی کے شاگرد ہیں۔

سید ناظر عباس زیدی

آخر میں مجھے سید ناظر عباس صاحب اردو ٹائپسٹ ریاست خیر پور کا شکریہ ادا کرنا بھی ضروری ہے۔ جنھوں نے زیرِ نظر تاریخ کے مسودے کی تین کاپیاں صرف 5 دن کی قلیل مدت میں ٹائپ کر دیں اور اس توجہ سے ٹائپ کیں کہ پوری کتاب میں دو چار الفاظ کی علاوہ کسی جگہ غلطی نہیں کی۔ حالانکہ میرا مسودہ صاف لکھا ہوا نہ تھا۔

سید ناظر عباس میرے ایک دوست سید علی عباس کے فرزند ہیں جو ریاست رامپور میں امور مذہبی کے سیکریٹری تھے۔ یہ 1929ء میں بمقام رامپور میں پیدا ہوئے۔ رسمی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ہز ہائنس بہادر نے آپ کو اردو ٹائپسٹ کے طور پر اپنے دفتر میں ملازم رکھ لیا۔ 1944ء میں رامپور کی مجلس قانون ساز نے ہز ہائنس بہادر سے آپ کی خدمات حاصل کر لیں۔ 1949ء میں آپ پاکستان چلے آئے اور ریاست خیر پور میں اردو ٹائپسٹ کی جگہ پر ملازم ہو گئے۔ آج کل محکمہ اطلاعات عامہ خیر پور میں اپنے فرائض بڑی خوبی اور خوش اسلوبی سے انجام دے رہے ہیں۔

ضمیمہ

جاری کردہ محکمہ اطلاعات خیر پور ڈویژن

تقریب و تعارف:

1950ء سے پہلے متحدہ ہند کے دوسری پسماندہ ریاستوں کی طرح خیر پور بھی ایک ایسا علاقہ تھا جہاں زرعی ترقیات اور صنعتی مشاغل کا فقدان اور وسائل معاش کی کمی تھی جس کے باعث یہاں کے باشندوں کا معیار زندگی بہت پست تھا۔ مگر 1950ء سے 1955ء تک مرزا ممتاز حسن قزلباش نے اپنی وزارت اعلیٰ کے دور میں اس خطہ ارض میں زرعی اور صنعتی ترقیوں کی ایسی وسیع شاہراہیں کھول دیں کہ دیکھتے ہی دیکھتے یہاں چھ سات بڑے کارخانے کھل گئے اور یہ علاقہ پانچ سال کی قلیل مدت میں زرعی سرزمین سے ایک زرعی صنعتی علاقہ بن گیا جس کی برکت سے اس کی آمدنی سہ چند ہوگئی۔ حالانکہ زرعی لگان پچیس فیصد کم کر دیا گیا تھا۔ ان سب واقعات کا مفصل ذکر تاریخ خیر پور میں کیا گیا ہے۔ جیسا کہ اس کی فہرست کے دیکھنے سے اندازہ ہوا ہے جو اس کے منصف نے سہ روزہ مراد میں شائع کی ہے۔ تاہم اوائل 1955ء کی دوسری وحدتوں (پنجاب وغیرہ) کے بالمقابل جن کی تعمیر پر ڈیڑھ سو برس سے ریاضت کی جارہی تھی ابھی اس علاقہ کی جانب مزید توجہ مبذول رکھنے کی ضرورت تھی کہ اتنے میں مغربی پاکستان کا صوبہ وجود میں آیا اور ریاست اس نئے صوبہ میں مدغم ہوگئی۔ اس موقع پر حکومت نے خیر پور کو اس کی صنعتی سرگرمیوں اور صلاحیتوں کے پیش نظر اس علاقہ کے پانچ ضلعوں کا صدر مقام قرار دیا اور اس طرح سابق سندھ کے چار پسماندہ اضلاع (سکھر۔ جیکب آباد۔ لاڑکانہ اور نواب شاہ) اس ڈویژن میں شامل ہو گئے۔

حکومت مغربی پاکستان جب وجود میں ائی تو اس نے اپنے ایک خصوصی اعلان کے ذریعہ پسماندہ علاقوں کے باشندوں کو یہ یقین دلایا کہ ان کی ترقی اور فلاح و بہبود کے لیے ہر ممکن جدوجد کی

اصلاحات سے ایک گہرا لگاؤ پیدا ہو جائے۔ اب یہ کام عوام کا ہے کہ وہ خود بھی اپنی ضرورتوں کا اجتماعی طور پر بیٹھ کر وقتاً فوقتاً جائزہ لیں اور ''اپنی مدد آپ کرنے'' کے اصول پر فلاح عامہ کے مفید اقدامات میں عملاً حصہ لیں۔ آج کی دنیا کے متمدن ملکوں کی تاریخ ارتقا نے یہ واضح کر دیا ہے کہ کسی ملک اور قوم کی خوش حالی اور ترقی کا دور عوام ہی کی اجتماعی کوششوں کے بعد آتا ہے۔ خصوصاً جب سرمایہ دار طبقہ اپنے سرمایہ میں اضافہ کرنے کی غرض سے ہی سہی، عوام کے لیے روزگار مہیا کرنے کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور اس سلسلہ میں عملی قدم اٹھاتا ہے تو ہر قسم کی ترقیات کے بے شمار دروازے کھل جاتے ہیں۔ ہم اگر ترقی کرنا چاہتے ہیں تو یہ بات اسی وقت حاصل ہوگی جب ہم میں سے ہر ایک اپنی حیثیت کے مطابق قربانی کرنے کے لیے تیار ہو جائے اور سب کے سب انفرادی طور پر اور مل جل کر کچھ نہ کچھ کام کرنے لگیں اور پھر اپنی آمدنی کو کفایت شعاری سے صرف کریں۔ یہ بھی ملحوظ رہے کہ بہت سے لوگ اپنی آمدنی کے مطابق ضروریاتِ زندگی کا سامان مہیا کرتے ہیں یہ طریقہ کفایت شعاری کے خلاف ہے'' بلکہ اس کے برعکس ''ضرورت'' کے مطابق سامان مہیا کرنا چاہیے۔ یہ بھی یاد رکھیے کہ بیکاری، سستی، عیاشی یہی سب باتیں قوموں کی تباہی کی نشانیاں ہیں۔ ہر انسان کا فرض ہے کہ وہ بے کار رہنے کے بجائے محنت مزدوری کو اپنی زندگی کا نصب العین بنائے اور خود اپنی حالت بدلنے کی کوشش کرے اور یاد رکھیے کہ ؎

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کی بدلنے کا

دورِ علی مراد میں خیر پور کا ایک مایہ ناز شاعر

(از اشرف النسا)

سچل فقیر سرمست

نام عبدالوہاب، تخلص سچو، سچل اور سچے ڈِنا۔ حال وسماع اور مستی و بے خودی کی وجہ سے انھیں ''سرمست'' کا لقب دیا گیا تھا جس طرح شاہ عبداللطیف بھٹائی پر رومؔی کے فلسفہ کا اثر غالب تھا، اسی طرح سچل منصوری اعتماد سے متاثر تھے۔

سچل فاروقی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ آپ کے بزرگوں میں شیخ شہاب الدین فاروقی، مجاہدِ اعظم فاتح سندھ محمد بن قاسم کے ہمراہ سندھ میں آئے اور سیہون میں رہنے لگے۔ محمد بن قاسم کی طرف سے آپ کو سیہون کا نواب مقرر کر دیا گیا، ان کی اولاد میں ایک بزرگ میاں صاحب ڈِنو فاروقی تھے جو سیہون سے اٹھ کر درازا نام ایک موضع میں چلے گئے۔ یہ موضع ضلع خیر پور میں رانی پور ریلوے اسٹیشن سے تقریباً ایک میل کے فاصلے پر خاموش اور پُرسکون خطہ ارض میں واقع ہے۔ سچل فقیر میاں صاحب ڈِنو کے پوتے تھے۔ ان کی تعلیم و تربیت خود میاں صاحب کے نگرانی میں ہوئی۔ سچل حافظ قرآن تھے اور علوم ظاہر و باطن میں کافی دستگاہ رکھتے تھے۔

میرانِ خیر پور سے سچل کے تعلقات

میرانِ خیر پور سے نہ صرف سچل کے بلکہ ان کے بزرگوں کے بھی بہت خوش گوار تعلقات تھے۔ چنانچہ جب سندھ کا علاقہ میروں کے درمیان تقسیم ہونے لگا تو میر سہراب خان نے میر احمد فاروقی ہی کے مشورے سے خیر پور کو اپنے لیے منتخب کیا تھا۔ اس کے علاوہ تعلقات کی استواری کا پتہ اس بات سے بھی چلتا ہے کہ جب ٹالپوروں نے کلہوڑوں پر فتح پائی اور سندھ کی حکومت ان کے قبضہ میں آئی تو اس وقت میر صاحبان نے فاروقی خاندان کی جاگیریں جو کہ انھیں سابق

مؤقف نے الفاظ کے تقدیم و تاخر سے اس طرح مسخ کر دیا ہے کہ اکثر اشعار خارج از بحر معلوم ہوتے ہیں اور پڑھنے والوں کو یہ دھوکا ہونے لگتا ہے کہ شاید پچل سندھی کی طرح فارسی (اور اردو کو بھی) بحر کی قید سے آزاد سمجھتے تھے۔ مثلاً کتاب مذکور کے صفحہ 320 پر دوسرا شعر اس طرح لکھا ہے۔

دلا بگور ز شخی و زبیری ——— برو بگو میں رسم و رہ فقیر

دوسرا مصرعہ صورت موجودہ میں خارج از بحر ہے۔ جو دراصل پچل نے اس طرح

بروبگوریں رہ ورسم فقیری

اردو کا کلام نمونہ کلام

جہاں تک پچل کی اردو شاعری کا تعلق ہے۔ اگر چہ وہ اس زمانہ کے شاعر ہیں جبکہ شمالی ہند میں اردو اپنے ابتدائی دور سے گزر کر ترقی کی منزلوں میں گامزن تھی مگر پچل کے کلام میں متقدمین اردو کے پہلے طبقے کا رنگ غالب ہے۔ خصوصاً ان کی زبان بالکل ایسی ہے جیسی میر و سودا کے ابتدائی کلام میں اور ان سے سابق شعرا کی یہاں پائی جاتی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

ابرو کمان دلبر مژگان خدنگ خنجر ——— ہم نے انھوں کے آگے سینہ سپر کیا ہے

اتنی یہ بے نیازی دلبر نہ کر پچل سے ——— اس کی گلی میں تم نے اکثر گزر کیا ہے

ایک اور غزل میں کہتے ہیں۔

دوئی کا دین باطل کر نکل باہر مذاہب سے ——— حکم یہ ایک ایکا کا بہر جا میں چلاوں گا

کہا یہ پیر نے مجھ کو نہ خود کو غیر حق جانو ——— ولا موجود الا ہو نقارہ میں بجاؤں گا

دلی دکنی جو بعض حلقوں میں غزلوں کا موجد سمجھا جاتا ہے اور اس کے دور کے دیگر شعرا کی زبان میں یہ شعر دیکھیے۔

دل بیتاب کہ اک آن نہیں اس کو قرار ——— زلف دلدار سوں ہمسر ہے پریشانی میں

اپنے مخصوص رنگ (ہمہ اوست) میں کہا ہے۔

ہو اول ہو الآخر ہو الظاہر ہو الباطن ——— اِدھر وہ ہی اُدھر وہ ہی پچو کہہ تم کجا ہوگا

ان خیالات معرفت کے علاوہ ان کے اردو کلام میں واردات عشق، ہجر و وصال کا ذکر اور عاشقانہ پیار اور محبت کی باتیں بھی ملتی ہیں۔ فرماتے ہیں۔

رفتہ آپ کی عمر کے ساتھ مشق سخن بھی روز بروز ترقی کرتی چلی گئی۔ چنانچہ اب آپ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے ہیں اور خوب کہتے ہیں۔

یوں تو احسن کا اصل جوہر سادگی اور بے تکلفی ہے مگر جب مضمون آفرینی پر آتے ہیں تو ایسی ایسی نکتہ سنجیاں کرتے ہیں کہ کہنہ مشق شعرا کے کلام کا لطف آجاتا ہے۔ ایک غزل کا مطلع سنیے، فرماتے ہیں۔

تری زلف دوتا ہے اور میں ہوں بلا کا سامنا ہے اور میں ہوں

اس مطلع میں بلا کی آمد اور سادگی کے علاوہ ایک اور خاص بات یہ بھی ہے کہ چھوٹی سے بحر میں اتنی طویل ردیف ہونے کے باوجود شعر نہایت پُر کیف ہے اور یہ بات کہنہ مشقی کے بغیر نہیں ہوتی۔ آگے چل کر اس غزل میں فرماتے ہیں۔

شب فرقت کا عالم کچھ نہ پوچھو فقط میرا خدا ہے اور میں ہوں

اس شعر میں لفظ ''میرا'' کے انتخاب کی داد نہیں دی جاسکتی جو دراصل شعر کا وزن پورا کرنے کے لیے چنا گیا ہے مگر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسی شعر کی اصل روح یہی ہے۔

پامال اور فرسودہ مضامین میں طرز ادا سے جدت دل کشی پیدا کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ مگر آپ کے اشعار میں جابجا یہ وصف پایا جاتا ہے۔ ایک قصیدے میں فرماتے ہیں۔

اللہ رب جمال رُخِ سید البشر جل جل کے بجھ رہا ہے کنول آفتاب کا

دوسرے مصرع میں جس خوب صورتی سے آورد کو آمد بنایا ہے اس پر بے ساختہ داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ اس سلسلہ کا ایک شعر سنیے۔

دیکھیں نگاہ بھر کے بھلا کیمیا کو خاک! سرمہ لگا کے خاک در بوتراب کا

''سرمہ اور خاکِ رد'' کے ذکر میں ''نگاہ بھر کے'' اور ''خاک دیکھیں'' ایسے دو خاک آگئے ہیں جنھوں نے اس پرانے مضمون میں ایک نیا مزہ پیدا کر دیا ہے۔ مضمون آفرینی ایک اور مثال سنیے۔

چنگیزیٔ فلک میری آواز سے اڑی ٹوٹا سا ایک تار ہوں گو میں رباب کا

اسی کے قصیدے کا ایک اور شعر ملاحظہ کیجیے جسے سن کر شک ہوتا ہے کہ خواجہ وزیر یا صبا بول رہے ہیں۔

لطیف جلوہ سب سے پہلے میری نظر نے ان کے نکتۂ نظر سے (یعنی حصول معرفت کی نگاہ سے) دیکھا۔ اس کے بعد کہتے ہیں۔

تھے خلوت ازل سے وہ اور میں مقابل | ارض و سما سے پہلے شمس و قمر سے پہلے

معرفت کا جو مضمون اس شعر میں کہا گیا ہے علوم و معارف کے ایسے مسائل آسان اور عام فہم لفظوں میں نظم کر دینا کوئی سہل بات نہیں۔ اس سے آگے بڑھ کر احسنؔ کہتے ہیں۔

افسانہ کیا بیاں ہو آغازِ عاشقی کا! | سودائے سر فروشی تھا مجھ کو سر سے پہلے

اقرارِ الست کی جانب اشارہ کرنے میں۔ سودائے سرفروشی اور ''سر'' کے اجتماع نے جو مزہ پیدا کر دیا ہے محتاج بیان نہیں۔ اس کے بعد کہا ہے۔

اب مل گیا جبیں کو ایک مرکزِ عقیدت | بکھرے ہوئے تھے سجدے اس سنگِ در سے پہلے

مرکزِ عقیدت نہ ہونے کو سجدوں کے بکھرے ہونے سے تعبیر کرنا ایک لطیف استعارہ ہے۔ جو نیا بھی ہے اور نرالا بھی، اب فرماتے ہیں۔

کیا داد دے گا کوئی اس جذبہ طلب کی | پیغام لے کر پہنچے ہم نامہ بر سے پہلے

اب اس اگر مگر سے عہد وفا نہ توڑو! | اقرار کر چکے ہو لفظ مگر سے پہلے

آزادیوں کے نغمے گاتے ہیں اب قفس میں | کرتے نہ تھے جو نالے گلچیں کے ڈر سے پہلے

ردیف میں بندش نے جو زور پیدا کر دیا ہے۔ اس کی داد نہیں دی جا سکتی۔ پھر کہتے ہیں۔

آغاز عاشقی میں یہ دید کا تقاضا | اس چشم تر سے کہہ دو کچھ اور تر سے پہلے

''چشم تر سے'' اور ''تر سے'' کے لفظی حسن کے علاوہ قافیہ اور ردیف کی ترکیب نے ایک عجیب لطف پیدا کر دیا ہے یہی خوبی مقطع میں بھی ہے فرماتے ہیں۔

احسنؔ اٹھا تو فطرت فیاضیوں پہ اتری | پیہم مچل مچل کر بادل نہ برسے پہلے

اب ہم آپ کو احسنؔ کی ایک ایسی غزل سناتے ہیں جس میں تغزل کی ساتھ ساتھ تسلسل بھی پایا جاتا ہے جو جدید تعلیم یافتہ گروہ کا غزل گو شعرا سے ایک اہم مطالبہ ہے۔ یہ غزل اپنی بحر اور زمین کے اختصار کے باوجود شاعر کی پختہ کاری اور قادر الکلامی کا ایک شاہ کار ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ غزل آپ نے کسی مقتدر ہستی کی موت سے متاثر ہو کر کہی ہوگی۔ اس میں شاعرانہ کمال کا خاص پہلو یہ ہے کہ شروع سے آخر تک ناپائیداری دنیا کا ایک ہی مضمون ہے جو رنگ رنگ سے کہا گیا

اردو کے ایک قطعہ میں پردۂ نسواں کے مخالفین پر طنز کرتے ہوئے فرماتے ہیں جو ہنسی کی ہنسی ہے اور سبق کا سبق۔

پردہ اٹھا رہے ہیں جو اپنے حرم کا آج — احسنؔ وہی حمیت و غیرت میں فرد ہیں
اِن سے ذرا کوئی سر بازار پوچھتا! — جو عورتوں کو گھر سے نکالیں وہ مرد ہیں؟

زیر نظر تاریخ کا ماخذ

1- فائل اخبار نیرّ اعظم (یوپی) 1915ء۔

2- تاریخ ''دارالسرور خیر پور'' مطبوعہ مطبع مطلع العلوم حاصل شدہ انجمن ترقی اردو رجسٹر ڈنمبر 269۔

3- تاریخ خیر پور از مرزا قلیچ بیگ بزبان سندھی۔

4- فائل سرکاری گزٹ از 1894ء لغایت 1947ء۔

5- فائل اخبار۔ وادیٔ سندھ شکار پور 1953ء۔

6- فائل اخبار سہ روزہ مراد خیر پور از 1952ء تا حال۔

7- کتبات عمارات خیر پور۔

8- پمفلٹ انگریزی نوشتہ سید حسن حبیب چیف سیکریٹری ریاست خیر پور۔

9- پمفلٹ ''ریاست خیر پور'' شائع کردہ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس۔

10- ریکارڈ شعبۂ عدلیہ ریاست خیر پور و دیگر محکمہ جات۔

11- تقریر قائد ملت نومبر 1950ء دسمبر 1951ء بمقام خیر پور۔

12- تقریر ڈاکٹر محمود حسین سابق وزیر ریاست ہائے پاکستان بمقام خیر پور فروری 1951ء بسلسلۂ صدارت اردو کانفرنس۔

13- تقریر پیر حسام الدین راشدی (فروری 1951ء) بمقام خیر پور بسلسلۂ اردو کانفرنس۔

14- تقریر نواب مشتاق احمد گورمانی وزیر داخلہ مغربی پاکستان مارچ 1954ء بمقام خیر پور بسلسلۂ افتتاح مقننہ خیر پور۔

15- تحریر عہد نامہ مابین میر رستم خاں و میر علی مراد خان اوّل نوشتہ بر اوراق سادۂ کلام پاک۔

16- تقریر نشر کردہ آل پاکستان ریڈیو۔ نومبر 1953ء۔

17- بیانات عمائدین خیر پور۔

18- ذاتی مشاہدات و معلومات۔